A HISTORICAL LIE:
THE STONE AGE
HARUN YAHYA

نظریۂ اِرتقا ایک تاریخی فریب

مصنف :

ہارون یحییٰ

ترجمہ نگار :

محمد افروز قادری چریاکوٹی

فہرست مضامین

پتھر کا زمانہ : ایک تاریخی فریب

پیش لفظ

Foreword

کیا آپ جانتے ہیں کہ سات لاکھ سال قبل لوگ بہترین اور پر آسایش بحری جہازوں میں سفر کیا کرتے تھے؟ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ ''غاروں میں رہنے والے فرسودہ انسان'' بھی عصر حاضر کے فنکاروں کی مانند فنی مہارت اور زیورِ فراست سے پورے طور پر آراستہ و پیراستہ تھے؟۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ اَسّی ہزار سال قبل روئے زمین پر آباد نینڈر تال قوم (Neanderthals) جس کی ارباب ارتقا نے نیم بندر والے آدمیوں کی سی تصویر کشی کی ہے، وہ آلات موسیقی ایجاد کرنے کی اہلیت سے بہرہ مند تھے، ملبوسات اور دیگر لوازامات سے اپنی تزئین و آرایش کرتے تھے، نیز سلیقے سے بنائی گئی سینڈل کے ساتھ تپتے ہوئے صحراؤں میں جادہ پیمائی بھی کیا کرتے تھے۔

گمانِ غالب ہے کہ آپ کو ان حقیقتوں کے سننے کا شاید کبھی اتفاق نہ ہوا ہو۔ اس کے برعکس آپ کو یہ غلط تاثر دیا گیا ہے کہ یہ لوگ نیم بندر اور نیم انسان تھے، پورے طور پر سیدھے کھڑے نہیں ہو سکتے، صحیح تلفظ کی ادائیگی سے قاصر محض عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکالتے تھے۔ جس کے باعث گزشتہ ڈیڑھ صدی کی مسلسل کوششوں سے جھوٹ کے یہ پلندے آپ جیسے انسانوں کو متاثر کرتے چلے آ رہے ہیں۔

اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وجودِ خالق مطلق کے انکار پر مبنی مادہ پرستانہ فلسفہ کو زندگی کی کمک فراہم کی جائے۔ اور اپنی راہ میں حائل ہر حقیقت کو توڑ مروڑ دینے والے اس نظریے کے مطابق یہ کائنات اور مادہ ہمیشہ سے ہیں بالفاظ دیگر ان کا کوئی نقطہ آغاز نہیں

توگویا ان کا کوئی خالق بھی نہیں۔اس وہم پرستانہ عقیدہ کے لیے فرضی علم کی کلیدی اساس یہی ''نظریہ ارتقا'' بنا ہے۔

چوں کہ مادہ پرستوں کا یہ دعویٰ ہے کہ کائنات کا کوئی خالق نہیں؛ لہٰذا ان کو اپنے اس نظریہ کے اثبات کے لیے دلیل فراہم کرنا ہوگی کہ آخر کرۂ ارض پر یہ زندگی اور کثیر الانواع اجناس کیسے عالم وجود میں آ گئے۔اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے نظریۂ ارتقا کا سہارا لیا جس کے مطابق کائنات میں زندگی اور نظم وضبط محض اتفاق کا نتیجہ ہے۔ پہلے پہل کائنات میں بعض غیر ذی روح مادے اتفاقیہ آپس میں مل گئے جن سے پہلا ذی روح حلیہ وجود میں آیا۔ ہزاروں لاکھوں سالوں کے انھی اتفاقات کے نتیجہ میں زندہ اجسام عالم ظہور میں آئے۔اور اس ارتقائی سلسلہ کے آخری مرحلہ میں انسان معمورۂ وجود میں جلوہ افروز ہوئے۔

اِنسانیت کی ابتدائی تاریخ کو خرد برد کر کے ایک ایسے منظر نامے میں اتارنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ انسان لاکھ ہا لاکھ تغیرات کے بعد وجود میں آیا ہے اور جس کا ہر اگلا تغیر پچھلے تغیر سے کہیں زیادہ ناممکن تھا۔ارباب ارتقا کے خیال خام کے مطابق تاریخ انسانی کے مراحل کچھ یوں ہیں کہ ابتدائی زندہ اجسام سے لے کر انتہائی پیش رفتہ انسان تک زندگی کی شکلیں جوں جوں ترقی کرتی رہیں، تو اسی طرح انسانی تاریخ بھی اپنے بالکل فرسودہ معاشرے سے انتہائی پیش رفتہ شہری معاشرہ تک تبدیلی کے مختلف مراحل سے ہو کر ضرور گزری ہوگی۔لیکن یہ مفروضہ، علمی شہادت سے مکمل طور پر عاری ہے؛ اور محض نظریہ ارتقا اور مادہ پرستانہ دعووں پر مبنی انسانی تاریخ کو پیش کرتا ہے۔

نظریہ ارتقا کے محققین نے تاریخ انسانی کو اپنے طور پر رقم کیا ہے۔اور اپنے مفروضہ ارتقائی سلسلے کے اثبات کے لیے دعوی کیا ہے کہ ایک حلیہ والے جسم سے کثیر الحلیہ اجسام، اور بندر سے لے کر انسانی وجود تک توسیعات کا ایک پیہم سلسلہ جاری رہا ہے۔انھوں نے ''فرسودہ انسان'' کے طرزِ زندگی کو بیان کرنے کے لیے خود ساختہ خیالی ادوار مثلاً غاروں میں رہنے والے انسانوں کا دور اور پتھر کا دور وغیرہ ایجاد کر رکھے ہیں۔

ارباب ارتقا نے اپنے دعووٗں کو سچا کر دکھانے کے لیے ایک نئی حکمت عملی یہ رچی ہے کہ انسان اور بندر اپنے نقطہ آغاز میں باہم مشترک الاصل ہیں؛ اور وہ آثار قدیمہ کی کھدائی کے وقت دستیاب ہونے والے ہر پتھر، نوکِ تیر، اور پیالے کی تعبیر اپنے اسی نظریہ کی روشنی میں کرتے چلے آ رہے ہیں، حالاں کہ بولنے کی صلاحیت سے عاری، پشمینہ کے کپڑے پہنے، تاریک غاروں میں بیٹھے ہوئے نیم بندر اور نیم انسانی مخلوقات کی یہ تصویریں اور خاکے مکمل طور پر جھوٹ کے پلندے اور حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ فرسودہ انسان کا کبھی کوئی وجود نہیں رہا ہے اور نہ پتھر کے دور کی کوئی حقیقت ہے، یہ صرف ارباب ارتقا کے گڑھے ہوئے پرفریب فسانے ہیں جسے میڈیا کی یک طرفہ تشہیر نے طشت از بام کر دیا ہے۔

یہ سب وہم وفریب پر مبنی تخیلات کے سوا اور کچھ نہیں؛ کیوں کہ بیالوجی، پیلینٹالوجی ، مائیکرو بیالوجی، اور جینیٹکس کے میدانوں میں سائنس کی موجودہ پیش رفت نے ارتقا کے دعووں کی مکمل طور پر تغلیط وتکذیب کر دی ہے۔ اسی طرح اجناس کی ارتقا اور آگے چل کر دوسری شکلوں میں ان کی تبدیلی کا نظریہ بھی مکمل طور پر باطل سمجھا گیا ہے۔ یوں ہی بندر جیسی مخلوق سے بنی نوع انساں کا ارتقا نہیں ہوا۔ انسان اپنے معرض وجود میں آنے کے دن ہی سے انسان ہے اور اپنے ابتدائی دور سے لے کر آج تک ایک شائستہ معاشرت کا حامل رہا ہے، لہٰذا سچی بات یہ ہے کہ ''ارتقاے تاریخ'' کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں رہا ہے۔

یہ کتاب اس سلسلے میں ٹھوس دلائل وبراہین پیش کرے گی کہ ''ارتقاے تاریخ انسانی'' والا نظریہ محض ایک جھوٹ ہے۔ نیز جدید سائنسی تحقیقات کے تناظر میں تخلیق کی حقیقت کا ثبوت بھی فراہم کرے گی کہ اس دنیا میں انسان ارتقا کے مراحل سے ہو کر وجود میں نہیں آیا بلکہ وہ تو اللہ -عزوجل- کی تخلیق کا شاہکارِ کامل ہے۔

سائنسی اور تاریخی دلائل وشواہد کی روشنی میں ان حقائق کے جلوے آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

مُقدّمۃ

Introduction

اِرتقاوالی تاریخ' انسانی ارتقا کے فرضی مراحل کی طرح تاریخ انسانی کو بھی مختلف ادوار میں تقسیم کردیتی ہے۔ پتھر کے زمانہ، کانسی کے زمانہ اور لوہے کے زمانہ جیسے جھوٹے نظریات 'ارتقائی تاریخ کے اہم ستون ہیں۔ اسکولوں، ٹیلی ویژن اور اخباری قصوں میں یہ خیالی تصویر پیش کرنے کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے اسے بلا چوں چرا قبول کرلیا ہے، ساتھ ہی یہ تصور کرتے ہیں کہ انسان تاریخ کے ایک ایسے دور میں بھی رہا ہے جب وہ محض فرسودہ پتھر والے اوزار استعمال کرتا تھا اور ٹکنالوجی کے استعمال سے یکسر ناواقف تھا۔

مگر آثارقدیمہ کی دریافتوں اور سائنسی حقائق کے مطالعہ کے بعد ایک یکسر جداگانہ تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ آج تک جو بھی آثار اور باقیات مثلاً اوزار، سوئیاں، بانسری کے ٹکڑے، اور زیبائش وآرائش کے سامان ہاتھ لگے ہیں ان سب سے یہی باور ہوتا ہے کہ انسان' تاریخ کے ہر دور میں ثقافت اور معاشرتی لحاظ سے مہذب زندگیاں بسر کرتے آئے ہیں۔

ہزاروں لاکھوں سال پہلے لوگ گھروں میں رہتے، کھیتی باڑی کرتے، اموال کا تبادلہ کرتے، پارچہ بافی کرتے، کھانے کھاتے، رشتہ داروں سے ملاقاتیں کرتے، موسیقی میں دلچسپی لیتے، تصویر کشیاں کرتے، بیماروں کا علاج کرتے اور عبادت والے اعمال سرانجام دیتے تھے۔

الغرض! وہ آج کے انسانوں کی طرح حسب معمول زندگیاں گزارتے تھے۔ وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے مبعوث پیغمبروں کے پیغام پر کان دھرا تو وہ ایک اللہ کی ذات پر ایمان لائے جب کہ دوسرے بدستور بتوں کی پرستش میں لگے رہے۔ اللہ پر ایمان رکھنے والے تو اس کے بتائے ہوئے اخلاقی اقدار کے پابند رہے، جب کہ دوسرے اوہام پرستانہ اعمال

اور کج رویانہ رسموں میں مشغول رہے۔تاریخ کے ہر دور میں آج کی طرح لوگوں کا ایک گروہ وجودِ الٰہی کی حقانیت پر یقین رکھنے والا اور دوسرا سرے سے کافر وملحد رہا ہے۔

بلاشبہ تاریخ میں کچھ لوگ ایسے رہے ہیں جو نسبتاً سادہ، معمولی اور فرسودہ حالات میں زندگیاں بسر کیا کرتے، اور بعض لوگ مہذب اور متمدن زندگیاں گزارتے تھے۔تو اس سے نام نہاد ارتقا کی تاریخ کے لیے کوئی دلیل نہیں فراہم کی جاسکتی کیوں کہ آج جب دنیا کے ایک کونے کے لوگ خلائی راکٹ روانہ کررہے ہیں تو دنیا کے ایک دوسرے کونے میں اب تک لوگ بجلی کے استعمال سے ناواقف ہیں؛ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ خلائی جہاز بنانے والے لوگ ذہنی اور جسمانی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہیں کیوں کہ وہ ارتقا کے مفروضہ مراحل طے کرکے آگے بڑھ چکے ہیں اور ثقافتی طور پر زیادہ پیش رفت کرلی ہے۔اور نہ اس دوسرے پس ماندہ گروہ کی جھوٹے بندر صفت انسان سے تعبیر کی جاسکتی ہے؛ بلکہ یہ محض ان کے ثقافتی اور تہذیبی امتیازات کی غمازی کرتی ہے۔

آثار قدیمہ کی دریافتوں کی توجیہ سے اَرباب ارتقا کی بے بسی :

Evolutionists Cannot Account for Archaeological Discoveries

جب بھی آپ ارتقا والی انسانی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو ایسے تفصیلی خاکے آپ کے سامنے ابھر کر آئیں گے کہ انسانوں کے مبینہ فرسودہ آباؤاجداد کس طرح روزمرہ کی زندگیاں گزارتے تھے۔جو لوگ اس موضوع کے تمام گوشوں کا علمی احاطہ کیے بغیر ان کو معتبر ومستند باور کرکے متاثر ہوئے ہیں تو ان کے تئیں تاریخ کے اس ''فنکارانہ تعمیر نو'' کی بنیاد سائنسی شہادت پر استوار ہے۔ارباب ارتقا کے جاری کردہ تفصیلی بیانات پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہزاروں سال پہلے ہی سے موجود رہے ہوں اور ان واقعات کے چشم دید گواہ ہوں۔ان کا دعویٰ ہے کہ جب ہمارے ان فرضی آباؤاجداد نے دو ٹانگوں پر کھڑے

ہونا سیکھا اور اپنے ہاتھوں سے کچھ کرنا نہیں جانتے تھے تو اس وقت انھوں نے اوزار بنانے شروع کیے اور عرصہ دراز تک محض پتھر اور لکڑی سے بنائے گئے اوزار کے علاوہ کسی اور مواد کے استعمال پر انھیں قدرت نہ تھی، پھر بہت بعد میں چل کر انھوں نے لوہے، تانبے اور پیتل جیسی دھاتوں کو بروئے کار لانا شروع کیا۔مگر سائنسی شہادت کی بجائے نظریہ ارتقا کے قائم کردہ رائے کی روشنی میں یہ ساری توجیہات ان دریافتوں کی غلط تعبیر پر مبنی ہیں۔

پال بہن(Paul Bahan)اپنی کتاب ''Archaeology: A Very Short Introduction''(آثار قدیمہ:ایک اجمالی تعارف) میں لکھتا ہے :

> انسانی ارتقا کی حقیقت ایک جھوٹی کہانی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔اس پر مستزاد یہ کہ سائنس کا اکثر و بیشتر حصہ اسی طرح کے قصے کہانیوں پر مشتمل ہے۔

نیز وہ لفظ ''کہانی'' کے مثبت انداز میں استعمال پر زور دیتا ہے اور حقیقت دراصل وہی ہے جو کچھ بیان ہوئی۔ پھر وہ اپنے قارئین کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نام نہاد انسانی ارتقا کی ان روایتی صفات مثلاً: کھانے پکانے، خیموں میں آگ جلانے، تاریک غار، رسم و رواج، اوزار بنانے، عمریں، جدوجہد اور موت- پر غور وخوض کریں۔وہ تعجب کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ ان قیاس آرائیوں کا تعلق کہاں تک ہڈیوں اور آثار قدیمہ سے ہے اور کس حد تک ادبی آئین ودستور سے۔ پال بہن اپنے پیش کردہ سوال کا کھلا جواب دینے سے جھجکتا ہے کہ انسان کا مبینہ ارتقا سائنسی شواہد سے زیادہ ''ادبی'' معیاروں پر مبنی ہے۔

درحقیقت ان توجیہات میں بہت سے ایسے جواب ناآشنا سوالات اور منطقی غیر آہنگیاں ہیں جن کی سراغ رسانی سے نظریہ ارتقا کی مانند سوچ رکھنے والے ہمیشہ ناکام رہیں گے۔مثال کے طور پر ارباب ارتقا پتھر کے زمانے کا حوالہ دیتے ہیں لیکن اس وقت کے منقش اور شکل وصورت اوزار و آثار کی توضیح میں نامراد رہے ہیں۔اسی طرح وہ اس بات کی وضاحت سے بھی قاصر ہیں کہ پر رکھنے والے حشرات الارض کس طرح پہلی دفعہ اڑنے لگے ،اگر چہ وہ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ڈائناسور کے پر بن گئے اور اس نے ان کو پکڑنے کے لیے اڑان بھرنے کی کوشش شروع کی۔اس قسم کے جملہ سوالات کو خود اپنے اور دوسروں

کے حاشیہ ذہن سے نکال دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پتھر کی تراش اور اس پر کشیدہ کاری کوئی آسان کام نہیں اور ایک پتھر کو دوسرے کے ساتھ رگڑ کر انتہائی موزوں اور استرے کی طرح تیز اوزار بنانا محال ہے، جیسا کہ اب تک کی آثار قدیمہ کی دریافت سے ظاہر ہے۔ ہاں! سخت پتھروں مثلاً گرینائٹ (بھربھرا پتھر) بسالٹ (سیاہ نرم آتش فشانی پتھر) یا ڈولے رائٹ (سخت سیاہ آتش فشانی پتھر) کو اسٹیل کی ریتی، خراد اور رندے کے ذریعہ کاٹ کر تراشنا ممکن ہے۔ اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ہزاروں سال پرانے کڑے، بالیاں اور ہار محض پتھر کے اوزاروں کو استعمال کر کے نہیں بنائے جاسکے۔ ان زیورات میں باریک سے سوراخ پتھروں سے نہیں بنائے جاسکتے اور نہ ان کی تزئین محض رگڑنے سے ممکن ہے بلکہ ان مذکورہ زیوروں کی نقش نگاری اور نفاست ونزاکت میں سخت دھاتوں سے بنائے گئے اوزار استعمال کیے گئے ہیں۔ آثار قدیمہ کے بہت سے محققین اور سائنس دانوں نے آزمائش کے لیے یہ تجربے کیے ہیں کہ آخر یہ قدیم شہ پارے ان حالات وشرائط میں کیسے بنائے جاسکتے ہیں جن کی ارباب ارتقا نے قیاس آرائیاں کی ہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر کلاس شمط (Claus Schmidt) نے ترکی میں گوبیکلے تپے (Gobekli Tepe) کے مقام پر تقریباً گیارہ ہزار سال پرانے پتھروں کے ٹکڑوں پر کشیدہ کاری کرنے کا ایک تجربہ کیا۔ اس نے کاریگروں کو پتھروں کے ایسے اوزار دیے جن کا ارباب ارتقا زمانہ قدیم میں استعمال ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور اُن جیسے پتھروں پر اس طرح کی کشیدہ کاری کرنے کے لیے کہا۔ تو دو گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد ان سے محض ایک مبہم سی لکیر بنانا ممکن ہو سکا۔

اس قسم کا تجربہ آپ اپنے گھر بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے گرینائٹ کی طرح سخت پتھر کا کوئی ٹکڑا لیں اور ایک لاکھ سال قبل لوگوں کے ہاتھوں استعمال ہونے والے ایک نیزے کی نوک بنانے کی کوشش کریں، لیکن گرینائٹ کے اس ٹکڑے کے لیے سنگی اوزار کے علاوہ کسی اور چیز کے استعمال سے گریز کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آپ اپنے اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ کیا آپ ان تاریخی آثار کی طرح تیز، متوازن

،ہموار اور چمک دار نوک بنا سکتے ہیں؟۔آؤ ذرا سا آگے بڑھیں: گرینائٹ کا ایک مربع میٹر ٹکڑا لیں اور اس پر عمق ظاہر کرنے والے ایک جانور کی تصویر کشی کرنے کو شش کریں۔اب اس پتھر کو دوسرے سخت پتھر کے ساتھ رگڑنے سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔یہ بات واضح ہے کہ آہن اور اسٹیل سے بنے ہوئے اوزار کی عدم موجودگی میں آپ نہ تو ایک سادہ نوکِ نیزہ بنا سکتے ہیں اور نہ اس پر دل کش پتھر کے نقوش کھینچ سکتے ہیں۔

پتھر تراشی اور اس پر نقش نگاری کے لیے اعلیٰ درجے کی قابلیت ومہارت درکار ہوتی ہے۔ریتی،خراد اور دوسرے اوزار بنانے کے لیے ضروری ٹکنالوجی ناگزیر ہے۔اس سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ان اشیا کی ایجاد کے وقت ہی یہ ''فرسودہ ٹکنالوجی'' کافی پیش رفتہ تھی، بالفاظِ دیگر ارباب ارتقا کے یہ دعوے خواب وخیال پر مبنی ہیں کہ اس وقت صرف سادہ پتھر کے اوزار زیر استعمال تھے اور ٹکنالوجی کا اپنا کوئی وجود نہ تھا۔حقیقت یہ ہے کہ'' محض پتھر'' والے دور کا کبھی کوئی وجود نہیں تھا۔

یہ بات کافی حد تک معقول ہے کہ پتھروں پر نقش اُتارنے اور تراشنے کے لیے جو لوہے اور اسٹیل کے اوزار استعمال ہوا کرتے تھے وہ تاحال باقی نہ رہے،فطرتاً مرطوب اور تیزابی ماحول میں ہر قسم کے دھاتی اوزار زنگ آلود ہوجاتے ہیں بالآخر وہ اپنے وجود سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اور جن پتھروں کو وہ استعمال میں لاتے تھے ان کے محض ریزے اور ٹکڑے باقی رہے کیوں کہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹنے کے لیے لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے،لیکن ان ٹکڑوں کا مطالعہ کرکے یہ تجویز کرنا کوئی سائنسی دلیل نہیں کہ اس وقت کے لوگ محض پتھر کے اوزار استعمال کیا کرتے تھے۔

بلاشبہہ متعدد ارباب ارتقا نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ آثار قدیمہ کے انکشافات ڈارون ازم (Darwinism) کے نظریات کی تائید نہیں کرتے۔آثار قدیمہ کے ارتقاپسند ایک محقق ریچرڈ لیکی(Riechard Leakey) نے اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ آثار قدیمہ کی دریافتوں خصوصا پتھر کے اوزاروں کی توجیہ نظریہ ارتقا کے حوالے سے پیش کرنا ناممکن ہے :

درحقیقت ڈارون کے مفروضہ کی ناپختگی کا ٹھوس ثبوت آثار قدیمہ کے دستاویز میں موجود ہے۔ اگر ڈارون کا منصوبہ صحیح ہوتا تو دو پائیگی، ٹکنالوجی اور بڑھی ہوئی دماغی جسامت کے ثبوت کا آثار قدیمہ اور نقوش کے دستاویز میں ہمہ وقت ظہور متوقع تھا، مگر ابھی تک ہمیں ایسی کوئی دلیل بہم نہیں ہوسکی۔ ماقبل التاریخ دستاویز کا محض ایک پہلو (یعنی پتھر کے اوزار کے دستاویز) یہ دکھانے کے لیے کافی ہیں کہ یہ مفروضہ یکسر غلط ہے۔ ا

ارتقا والی جھوٹی تاریخ

The Fictitious Evolutionist Chronology

ارباب ارتقا تاریخ کی درجہ بندی میں اپنے نظریے کے مطابق دریافت شدہ اشیا کی تعبیر کرتے ہیں۔ کانسی کے شہ پارے کی ایجاد کے دور کو وہ کانسی کا دور کہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی لوہے کے استعمال کو حال ہی کی پیداوار کہتے ہیں، اور یہ ان کے اس دعوے پر مبنی ہے کہ انتہائی قدیم تہذیب وتمدن میں دھاتوں کا استعمال غیر معروف تھا جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔ تاہم لوہا، اسٹیل اور دوسری کئی قسم کی دھاتیں بہت جلد زنگ آلود ہو کر سڑ گل جاتی ہیں، اس کے بالمقابل پتھر کافی دیر تک باقی رہتا ہے۔ کانسی جیسی بعض دھاتیں دوسری دھاتوں کے مقابلہ میں دیرپا اور مشکل سے زنگ آلوزہ ہوتی ہیں۔

یہ بالکل ہی فطری بات ہے کہ کھدائی سے حاصل شدہ کانسی کے بنے ہوے سامان کو لوہے والے سے قدیم تر ہونا چاہیے۔ مزید برآں منطقی طور پر یہ بات قابل اعتبار نہیں کہ کانسی بنانے کی مہارت اور اس کی فنی باریکیوں پر دسترس رکھنے والا معاشرہ لوہے اور دوسری دھاتوں کے استعمال سے ناواقف تھا۔ قلعی، سنکھیا، سرمہ، جست کی تھوڑی سی مقدار کو تانبے کے ساتھ ملانے سے کانسی حاصل ہوتی ہے۔ ایک کانسی بنانے والا تانبہ، قلعی، سنکھیا، جست اور سرمے جیسے کیمیائی عناصر کے تفصیلی علم پر ضرور آگاہ ہوگا، ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہوگا کہ یہ عناصر کن درجہ حرارت پر پگھلتے ہیں نیز پگھلانے اور ان کو آپس میں ملانے والی بھٹیاں بھی

ان کے پاس تھیں ۔اس تفصیلی علم کے بغیران کامیاب بھرتوں کی پیداوار ممکن نہ تھی۔آغاز میں خام تانبا' پرانے سخت پتھروں کے درمیان سفوف، یا بلوری شکل میں پایا جاتا ہے۔ (جس کو'' اصل تانبا'' بھی کہا جاسکتا ہے) تانبے کے استعمال پر دست گاہ رکھنے والے معاشرہ کوسفوف کی شکل میں پتھروں کے درمیان اس کی پہچان کا بھی ایک حد تک علم ہونا چاہیے ،تا کہ پھر سرنگ بنا کر ان کو دوسری چٹانوں سے الگ یکجا کر کے سطح زمین پر لے آئے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ اس طریقہ کار کو محض پتھروں اور لکڑیوں کے اوزار سے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔ خام تانبہ، کو مائع بنانے کے لیے انتہائی گرم شعلوں میں ڈالا جاتا ہے۔تانبے کی صفائی اور پگھلاؤ کے لیے مطلوبہ درجۂ حرارت ایک ہزار چوراسی اعشاریہ پانچ ڈگری سینٹی گریڈ ((1,984°F پھر ایک ایسے آلے یا دھونکنی کی ضرورت پڑتی ہے جو ہوا کے مسلسل بہاؤ کو آگ کی طرف برقرار رکھ سکے۔ایک تانبا ساز معاشرہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی بھٹی تعمیر کرے جو اتنی اونچی درجہ حرارت پیدا کرنے کے قابل ہو۔نیز بھٹی میں استعمال ہونے کے لیے چمٹی اور کڑا ہے جیسے آلات بھی بنا سکے۔

یہ وہ مختصر فنی خاکہ ہے جو تانبے کو قابل استعمال بنانے کے لیے درکار ہے۔تانبہ بذات خود اتنی نرم دھات ہے کہ اپنے کنارے کی تیزی کو تادیر برقرار نہیں رکھ سکتی۔تانبے کے ساتھ قلعی ،جست اور دوسرے عناصر کے ملاپ سے سخت تر کانسی کی پیداوار اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔کیوں کہ ہر دھات کے لیے مختلف طریقہ ہائے کار درکار ہوتے ہیں۔یہ تمام حقائق اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ معدنیات میں مشغول برتھوں کی پیداوار اور دھاتوں کے استعمال والے معاشرے کے پاس ان کا تفصیلی علم ضرور رہا ہوگا۔یہ بات نہ تو منطقی اور نہ اس کے دعوے میں کوئی ہم آہنگی ہی ہے کہ ایسے جامع علم رکھنے والے لوگوں نے لوہے کو کبھی دریافت نہ کیا ہو ۔اس کے برعکس آثار قدیمہ کے انکشافات ظاہر کرتے ہیں کہ ارباب ارتقا کا یہ دعویٰ سرے سے غلط ہے کہ قدیم معاشروں میں دھاتیں غیر معروف اور غیر مستعمل تھیں ۔ اس بات کی دلیل ان انکشافات میں موجود ہے جو ایک لاکھ سال قبل کے دھاتی برتنوں، دو کروڑ اسّی لاکھ سال پرانے دھاتوں کے گولے، تخمیناً تیس کروڑ سال پرانا لوہے کا

ایک برتن، ستائیس ہزار سال قبل کے چکنی مٹی میں کپڑے کے پارچہ جات، اور ہزاروں سال پرانے آثار قدیمہ میں میگنی شیم اور پلاٹینیم جیسی ان دھاتوں کے آثار جو یورپ میں اب محض چند سو صدی پہلے کامیابی سے پگھلائے گئے۔ روئے زمین پر بکھرے ہوئے یہ آثار کھردرے پتھر کے دور، پالش شدہ پتھر کے دور، کانسی کے دور اور لوہے کے دور والی درجہ بندیوں کو مکمل طور پر تہس نہس کر دیتے ہیں۔ان انکشافات کا زیادہ تر حصہ بہت سی سائنسی مطبوعات میں شائع ہو جانے کے باوجود نظریہ ارتقا والے سائنس دانوں نے یا تو اسے یکسر نظر انداز کر دیا یا عجائب گھروں کے تہ خانوں میں چھپائے رکھا۔تاریخ انسانی بیان کرنے کے لیے سچے حقائق پیش کرنے کی بجائے پر کشش ارتقا والی کہانیاں گڑھی گئی ہیں۔

اہل ایمان کی مہذب زندگیوں سے پوری تاریخ مالا مال ہے
Believers Have Led Civilized Lives Throughout History

تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی طرف لوگوں کو دعوت دینے کے لیے پیغمبران گرامی مبعوث فرمائے ہیں۔بعض لوگ ان نبیوں کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال کر اللہ کی وحدانیت اور اس کے وجود پر ایمان لائے جب کہ بعض لوگ حسب حال اپنے کفر پر جمے رہے۔جب سے انسان عالم وجود میں آیا ہے، اس نے وحی الٰہی کے وسیلے سے ایک خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان لانا اور سچے دین کے اخلاقی اقدار اپنانا سیکھا ہے۔اس لیے ارباب ارتقا کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ فرسودہ معاشرے ایک خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان رکھنے سے تہی دامن تھے۔(اسی موضوع پر تفصیلی معلومات آپ اسی کتاب کے آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں گے)

قرآن میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ تاریخ کے جملہ ادوار میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ایمان لانے اور دین کی اخلاقی قدروں سے آراستہ کرنے کے لیے پیغمبر بھیجے ہیں:

لوگ ایک دین پر تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے انبیا بھیجے خوش خبری دیتے اور ڈر

سناتے، اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری کہ وہ لوگوں میں ان کے اختلافوں کا فیصلہ کردے اور کتاب میں اختلاف انھیں نے ڈالا جن کو دی گئی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس روشن حکم آچکے آپس میں سرکشی سے تو اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو وہ حق بات سوجھا دی جس میں جھگڑ رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ جسے چاہے سیدھی راہ دکھائے۔ (سورۂ بقرہ؛۲/ ۲۱۳)

ایک دوسری آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر معاشرہ میں ایک پیغمبر مبعوث فرمایا ہے تاکہ وہ اس معاشرہ کے افراد کو اللہ کی پکڑ سے خبردار کریں، اللہ کی وحدانیت اور اس کے وجود کی یاددہانی کرائیں اور مذہبی اقدار پر کاربند ہونے کی دعوت دیں۔

اور جو کوئی گروہ تھا سب میں ایک ڈرسنانے والا گزر چکا۔ (سورۂ فاطر؛ ۳۵/ ۲۴)

اللہ تبارک وتعالیٰ کے انسانی پیغمبر اور مقدس صحیفے بھیجنے کے باوصف بعض لوگ شک وتردد کا شکار رہے، سچے دین کے اقدار سے روگردانی کی اور باطل اوہام پرستانہ عقائد پرڈٹے رہے۔ بعض نے اپنے کافرانہ عقائد اختیار کر کے زمین، پتھر، لکڑی، چاند، سورج اور اسی طرح بدروحوں کی عبادت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ آج حقیقی مذہب پر ایمان رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی ہیں جو آگ، چاند، سورج اور لکڑی سے بنے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اللہ کے وجود اور اس کی یکتائی سے مکمل باخبر ہونے کے باوجود اس کے کچھ شریک ٹھہرالیے ہیں، مگر اس کے باوصف اللہ تعالی نے پیغمبر بھیجے ہیں اور جس غلطی میں وہ ملوث تھے اس کی نشان دہی کی ہے۔ اور ان کو ان کے اوہام پرستانہ عقائد چھوڑنے اور حقیقی مذہب کے دائرے میں رہ کر زندگی گزارنے کی تلقین کی ہے۔ تاریخ کے تمام ادوار میں کافرومومن کا وجود ملتا ہے، یعنی ایک وہ جو خالص ایمان سے آراستہ تھے اور ایک وہ جو گم کردۂ راہ تھے۔

پوری تاریخ میں پیغمبروں کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے والے اہل ایمان نے انتہائی مہذب حالات میں ایک اعلیٰ قسم کی زندگی گزاری ہے۔ جس طرح کہ آج اہل ایمان

اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں اسی طرح انھوں نے بھی حضرت نوح، ابراہیم، یوسف، موسیٰ، اور سلیمان -علیہم الصلوٰۃ والسلام- جیسے عظیم الشان پیغمبروں کے ادوار میں ایک باسلیقہ معاشرتی زندگی گزاری ہے۔ تمام ادوار میں اہل ایمان نے نماز پڑھی، روزے رکھے، اللہ کے قائم کردہ حدود کی پابندی کی، اور پاکیزہ اور مہذب زندگیاں گزاریں۔

آثار قدیمہ کی دریافتوں سے آشکار ہوتا ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنے والے خوش نصیبوں نے کیسی اعلیٰ واشرف اور اطہر زندگیاں گزاری ہیں۔ پیغمبران گرامی اور سچے اہل ایمان، رضائے الٰہی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے وقت کے دستیاب بہترین وسائل کو استعمال کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم -علیہ السلام- اور ان کے ساتھ ایمان والوں نے نمرود کے عہد میں مروجہ جملہ فنی لوازمات کا بہترین طریقے پر استعمال کیا۔ حضرت یوسف، موسیٰ، ہارون -علیہم السلام- اور ان کے ساتھ اہل ایمان نے فرعون کے دور میں موجودہ فنی تعلیم سے پورے طور پر استفادہ کیا۔ حضرت سلیمان -علیہ السلام- کے دور میں فن تعمیر، فنون لطیفہ اور ذرائع ابلاغ کے میدانوں میں حاصل کردہ ٹکنالوجی کا اعلیٰ درجہ، انتہائی حکیمانہ انداز میں استعمال کیا گیا۔ حضرت سلیمان -علیہ السلام- کو خزانہ قدرت سے وافر مقدار میں عطا کی گئی دولت وسطوت کو سن کر آئندہ نسلیں انگشت بدنداں ہو جاتیں ہیں۔

ہمارے لیے یہ یاد رکھنا نہایت ضروری ہے کہ سیکڑوں ہزاروں سال پہلے اور آج کے دور کے لوگوں کے پاس معلومات اور وسائل، اللہ کی بے کراں نعمتوں کا ایک مظہر ہیں، جن لوگوں نے سیکڑوں ہزاروں سال پہلے تہذیبوں کی بنا ڈالی، ہزاروں سال پہلے دیوار ہائے غار پر خوش منظر تصویر کشی کی، اہرام بنائے، پتھر کی عظیم یادگاریں بنائیں، اور 'پیرو' میں انتہائی اونچائیوں پر عالیشان عمارتیں تعمیر کیں یہ سب کچھ الٰہی تعلیمات والہامات ہی سے ممکن ہوا۔ وہ لوگ جو آج ایٹم سے چھوٹے ذرات کی تحقیق کرتے ہیں، خلا میں جہاز بھیجتے ہیں اور کمپیوٹر سافٹ ویئر کی ساخت کرتے ہیں تو یہ سب درحقیقت اللہ کے چاہے سے ایسا کرتے ہیں۔ اپنی تخلیق سے لے کر اب تک انسان کی جملہ تعمیر وترقی اللہ کی نعمتوں ہی کی مرہون منت ہے۔ اسی طرح ہر تہذیب کی بنا میں اللہ ہی کی کاریگری کا دخل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیستی سے بنایا اور انھیں حیات دنیوی میں گونا گوں نعمتوں سے

نوازتا اور مختلف آزمائشوں سے گزارتا رہتا ہے۔ ہر نعمت ایک آزمائش ہے، وہ لوگ جو اپنے پاس دستیاب وسائل، ٹکنالوجی اور تہذیب کو اللہ تعالیٰ کی نعمت خیال کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی نعمتوں میں اضافہ فرماتا ہے۔

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے سنا دیا کہ اگر احسان مانوگے تو میں تمھیں اور دوں گا۔ (سورۂ ابراہیم: ۱۴/۷)

اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں اپنے مخلص بندوں کو خوش گوار زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ قرآن نے اس کی نشان دہی یوں کی ہے :

جو اچھا کام کرے مرد ہو یا عورت اور ہو مسلمان تو ضرور ہم اسے اچھی زندگی چلائیں گے اور ضرور انھیں ان کا اجر دیں گے جو ان کے سب سے بہتر کام کے لائق ہوں۔ (سورۂ نحل: ۱۶/۹۷)

اس آیت کے مظہر کے طور پر پوری تاریخ میں تمام مسلمانوں نے ہر دور کے اندر بہترین زندگیاں بسر کی ہیں اور خوش گوار زندگیاں گزاری ہیں۔ ہاں! قدرتی طور پر بعض تکالیف ومشکلات کے ذریعہ وہ آزمائے بھی گئے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے بے چارگی، فرسودہ، غیر مہذب اور انسانیت سے گری ہوئی زندگیاں گزاری ہیں۔ رہے وہ لوگ جو منکر خدا ہو کر اپنی اسی کافرانہ روش پر برقرار رہے اور اخلاقی قدروں سے گر کر زمین میں فتنے جگاتے رہے خواہ وہ کتنے ہی ذی ثروت، پرآسائش اور اپنی تہذیب وثقافت کی اعلیٰ منزل پر فائز ہو رہے ہوں انجام کار وہ نہایت کسمپرسی کے عالم میں حسرت وندامت کا داغ لیے دنیا سے رخصت ہوئے۔ مزید برآں ان میں سے اکثر کے پاس شاید آج کے موجودہ معاشرے سے کئی گنا زیادہ ترقی یافتہ ٹکنالوجیاں موجود تھیں۔ قرآن نے اس حقیقت کو یوں واشگاف فرمایا ہے :

اور کیا انھوں نے زمین میں سفر نہ کیا کہ دیکھتے کہ ان سے اگلوں کا انجام کیسا ہوا، وہ ان سے زیادہ زورآور تھے اور زمین جوتی اور آباد کی ان کی آبادی سے زیادہ اور ان کے رسول ان کے پاس روشن نشانیاں لائے تو اللہ کی شان نہ تھی کہ ان پر ظلم کرتا ہاں وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ (سورۂ روم: ۳۰/۹)

تہذیبی ارتقا کسی ارتقائی عمل کا ثبوت نہیں

Cultural Accumulation Is No Evidence of Any Evolutionary Process

ارباب ارتقا اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ پہلے انسان نیم بندر مخلوق تھے جن کی ذہنی اور جسمانی صفات وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہیں اور انھوں نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے نئی تہذیبوں کو جنم دیا۔ کسی سائنسی ثبوت سے عاری اس دعوے کے مطابق کہ ہمارے فرضی فرسودہ آباؤ اجداد بہیمانہ زندگی گزارتے تھے، انسان بننے کے بعد انھوں نے تہذیب سیکھا اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کی نشو ونما کے ساتھ ان کی ثقافتی سرگرمیاں عمل میں آئیں۔ فرسودہ انسان کی یہ جھوٹی تصویریں غیر سائنسی ثبوت پر مبنی بے بنیاد ایجادیں ہیں جس میں اس کا بدن مکمل طور پر پشمینہ سے ڈھکا ہوا، جانوروں کے چمڑوں کے نیچے دوزانو بیٹھا ہوا آگ جلانے کی تلاش کرتا ہوا، اپنے کندھے پر تازہ شکار کیے ہوئے جانور کو لاد کر پانی کے کنارے چلتا ہوا، اشاروں اور بھنبھناہٹ کے ساتھ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ باتوں کی کوشش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آثار قدیمہ کے دستاویز ان خیالی تصویروں کی تائید نہیں کرتے۔

تمام سائنسی دریافتیں اس حقیقت کو آشکار کرتی ہیں کہ انسانٔ نیستی سے بطورِ انسان پیدا ہوا ہے اور اپنے وجود کے پہلے دن ہی سے وہ انسان رہا ہے۔ کوئی بھی قدیم دریافت تاریخ ارتقا کی کسی بھی پہلو سے تائید نہیں کرتی۔ ارباب ارتقا جس دور کے بارے میں یہ دعوی کرتے ہیں کہ انسان نے ابھی اس وقت بولنا شروع کیا تھا اس وقت کی دریافتیں یہ دکھاتی ہیں کہ اس وقت کے انسانوں کے پاس باورچی خانے بھی تھے، اور وہ خاندانی زندگیاں بھی گزارتے تھے۔ ارباب ارتقا جس وقت کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ انسان فن کاریگری سے ناآشنا تھا تو آثار قدیمہ کی کھدائی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس وقت بھی منقش ظروف اور رنگ سازی کے لیے خام مواد موجود تھے۔ اس کتاب کے آئندہ ابواب میں بہت سی مثالوں

کی روشنی میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی جائے گی۔

یہ تمام دریافتیں دکھاتی ہیں کہ انسان نے کبھی بھی فرسودہ اور بہیمانہ زندگی نہیں گزاری ہے۔کوئی ایسا غیر تہذیب یافتہ دور نہیں گزرا جس میں تمام انسان صرف پتھر اور لکڑی کے اوزار استعمال کرتے رہے ہوں۔اہل ایمان ہمیشہ انسانی طرز زندگی گزارتے رہے، اور کپڑوں، رکابیوں، پیالوں، چمچوں اور کانٹوں کو اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کرتے رہے۔انسان ہمیشہ اپنے تقاضوں کے مطابق فنون لطیفہ کا استعمال کرتا،عمارتوں کی تعمیر، اور بول چال کے ساتھ زندگی گزارتا تھا۔اپنی معاشرتی ضرورتوں کی تکمیل کے پیش نظر اس نے ڈاکٹر،اساتذہ، درزی، انجینئر، معمار، اور فنکار کے پیشے اختیار کیے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل سلیم سے اس نے زمین پر بکھری اس کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

بلاشبہ ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ جب انسانی علوم نے ترقی کی تو قدرتی طور پر بعض فنی تبدیلیاں بھی ضرور ہوئی ہیں۔وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے آلات ایجاد کیے گئے ،سائنسی دریافتیں عمل میں آئیں اور ثقافتی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔تاہم وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ علمی اور فنی ترقی کا یہ مطلب نہیں کہ انسانیت کا کوئی ارتقا بھی عمل میں آیا ہے۔

قدرتی طور پر انسانی علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔جیسا کہ ایک شخص یونیورسٹی ،ہائی اسکول اور پرائمری اسکول میں تعلیم کے مختلف درجوں سے گزرتا ہے۔لیکن اگر کوئی شخص اپنی پوری زندگی مسلسل کسب علم میں لگا رہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مستقل طور پر غیر شعوری اثرات کے تحت ترقی اور ارتقا کر رہا ہے۔اسی طرح کا ایک اثر آفریں اصول ایک معاشرے کی زندگی پر بھی منطبق ہوتا ہے۔کسی معاشرے کی ضرورتوں کی روشنی میں نئی ایجادات سامنے آتی ہیں اور نئے طریقہ کار وضع کیے جاتے ہیں جن کو آئندہ نسلیں آگے چل کر بہتر بناتی رہتی ہیں۔لیکن اسے ارتقا کا عمل نہیں کہا جا سکتا۔

تہذیبوں کی پسپائی اور پیش رفت

Civilizations Retreat as well as Advance

ڈاروِنزم اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ انسان اوراس کی فرسودہ ثقافت ابتدائی، قدیمی اور قبائلی مراحل سے گزر کر ایک تہذیب پر منتج ہوئی ہے، تاہم آثار قدیمہ کی دریافتیں دکھاتی ہیں کہ انسانی تاریخ کے روزِاول ہی سے بعض معاشروں نے اپنے ادوار میں اپنی ثقافتوں کو بام عروج پہنچادیا ہے جب کہ ان کے مقابلے میں بعض دوسرے کافی حدتک پسماندگی سے دوچار رہے۔ بسا اوقات ایک دور میں انتہائی پرثروت تہذیبوں کے ساتھ فرسودہ پس ماندہ معاشرے بھی موجود رہے ہیں۔ کئی معاشرے اپنی معاشرتی اور ثقافتی امتیازات کے ساتھ ٹکنالوجی اور تہذیب کے مختلف معیاروں پر فائز رہے ہیں، جیسا کہ آج کل دیکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر براعظم شمالی امریکہ طبی سہولتوں، سائنس، فن تعمیر اور ٹکنالوجی میں گرچہ بہت ترقی یافتہ ہے لیکن اس کے مقابلہ میں جنوبی امریکہ ٹکنالوجی کے میدان میں نہ صرف پس ماندہ بلکہ بیرونی دنیا سے بھی پورے طور پر بےتعلق ہے۔

دنیا کے بہت سے علاقوں میں جدید عکسی آلات اور تجزیاتی رپورٹوں سے بیماریوں کی تشخیص کی جاتی ہے، اور جدید آلات سے آراستہ ہسپتالوں میں ان کا علاج ومعالجہ ہوتا ہے لیکن دنیا کے بعض حصوں میں اب تک بدروحوں کو بیماریوں کا باعث سمجھا جاتا ہے اور ان کا علاج ایسی روحوں کے چنگل سے چھڑانے والے مراسم پر مشتمل ہوتا ہے۔ علاقہ دریائے سندھ کے کنارے آباد لوگ، قدیم اہل مصر اور تین ہزار سال قبل آباد سومیری قوم آج کے موجودہ قبائل اور بہت سے ترقی یافتہ معاشروں سے ثقافتی طور پر زیادہ آسودہ حال تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ کے جملہ ادوار میں انتہائی پیش رفتہ معاشرے اور نسبتاً پس ماندہ معاشرے ساتھ ساتھ رہے ہیں۔

ہزاروں سال پہلے موجود بہت سے معاشرے بیسویں صدی کے بعض معاشروں سے نسبتاً زیادہ پیش رفتہ ہوکر گزرے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرسودہ سے لے کر تہذیب

یافتہ معاشرے تک ارتقائی مراحل میں کسی قسم کی کوئی ترقی واقع نہیں ہوئی ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ تمام میدانوں میں بڑی بڑی ترقیاں عمل میں آئیں، سائنس اور ٹکنالوجی کی بے کراں ترقیوں اور مہموں کا راز ثقافت اور تجربے میں افزودگی کا مرہون منت ہیں۔ تاہم یہ بات نہ منطقی ہے اور نہ سائنسی، جیسا کہ اہل ارتقا اور مادہ پرست ان تبدیلیوں کو عمل ارتقا سے منسوب کرتے ہیں۔ اور جس طرح کہ آج کے انسان اور ہزاروں سال پہلے والے انسان کی جسمانی صفات میں کوئی فرق نہیں ہے، اسی طرح ان کی ذہانت اور صلاحیتوں میں بھی کوئی تفاوت نہیں ہے۔ یہ نظریۂ ارباب ارتقا کی تعلیمات پر مبنی ایک ناقص پس منظر ہے کہ اکیسویں صدی کے انسان کی ذہنی صلاحیت وذہانت قدیم زمانے کے انسان سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آج بھی متعدد علاقوں کے لوگ مختلف نظریات اور ثقافتوں کے علم بردار پائے جا سکتے ہیں۔ اگر اسٹریلیا کیا یک اصل باشندے کا مبلغ علم وہ نہیں ہے جو ایک امریکی سائنس داں کا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی ذہنی قابلیت ولیاقت نے کافی ترقی نہیں کرلی ہے۔بجلی کے وجود سے بے خبر معاشروں میں پیدا ہوئے افراد بھی انتہائی ذہین ہوسکتے ہیں۔

مزید برآں مختلف صدیوں کے دوران مختلف ضرورتوں نے سر اٹھایا ہے۔ ہمارے فیشن کے معیار وہ نہیں ہیں جو قدیم مصریوں کے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہماری ثقافت ان سے زیادہ پیش رفتہ ہے۔ فلک بوس عمارتیں اکیسویں صدی میں تہذیب کی علامتیں ہیں، جب کہ مصری دور میں تہذیب کی نشانی اہرام اور ابوالہول تھے۔اصل چیز وہ تناظر ہے جس میں حقائق کی تعبیر کی جاتی ہے۔اگر کوئی بندہ پہلے سے قائم کردہ نظریے کے مطابق یہ تحقیق کرنا شروع کردے کہ حقائق نام نہاد ارتقائی ترقی کی تائید کرتے ہیں تو وہ اس تعصب کی روشنی میں تمام حاصل کردہ معلومات کی تفتیش کرے گا، اس طرح وہ فرضی کہانیوں سے اپنے دعوؤں پر سند لانے کی کوشش کرے گا، پہلے سے قائم کردہ اپنے نظریے کے مطابق پرانی ہڈیوں کے ٹکڑوں کی بنیاد پر بہت سی تفصیلات کا اندازہ لگائے گا کہ اس علاقے میں رہنے والے لوگ اپنی روزمرہ زندگیاں کیسے گزارتے تھے؟ ان کے خاندانی رشتے اور ان

کے معاشی تعلقات کیا تھے؟ تو ان ہڈیوں کے ٹکڑوں کے تجزیے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جن زندہ لوگوں سے وہ متعلق تھیں وہ تقریبا نیم مستقیم حالت میں کھڑے بھنبھنا رہے تھے ، بالوں میں ڈھپے ہوئے ، اور پتھر والے خام اوزار استعمال کرتے تھے ، اور یہ سب کچھ سائنسی دلیل پر نہیں بلکہ پہلے سے قائم کردہ اپنے نظریے کی وجہ سے ہے۔ یہ فریبی تصویر ڈارون والی ذہنیت کی تعبیرات سے ہوکر آتی ہے۔

حجریہ، منقش پتھر یا غاروں کی دیوار پر تصویر کشی والے باقیات کی بنیاد پر حال ہی میں ان ادوار کے بارے میں آثار قدیمہ کے ماہرین کی پیش کردہ تفصیل مذکورہ مثال سے خاصی مختلف ہے۔ مگر ارباب ارتقا بڑی عیاری سے برائے نام فرسودہ انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بابت اپنی دلیل کے متعصّبانہ تجزیے کو بنیاد بنا کر پیش کردیتے ہیں۔ ان کے یہ خوش رو بیانات اور وضاحتیں آج بھی بہت سے اخبارات اور رسالوں کے صفحات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔

ایک نام نہاد فرسودہ انسان کی روزمرہ زندگی کو اُجاگر کرنے والا ایک مشہور معاصر ارتقا پسند لویس لیکی (Louis leakey) کا ایجاد کردہ ایک منظرنامہ یہاں بطورِ نمونہ پیش کیا جاتا ہے :

> آؤ ایک لمحہ کے لیے تصور کریں کہ ہم بیس یا تیس ہزار سال قبل کے ایک پتھریلے ٹھکانے پر کھڑے ہیں اور اس وقت کے واقعات کا مشاہدہ کر رہے ہیں ، پتھر کے زمانے کا ایک شکاری شکار کی تلاش میں ایک وادی میں پھر رہا ہے، جب وہ اپنے اوپر ایک کڑی چٹان کے بغل میں ایک پناگاہ دیکھتا ہے تو بڑے احتیاط اور سہمے ہوئے انداز میں وہ اس تک چڑھتا ہے لیکن ساتھ ہی اسے یہ خطرہ بھی لاحق ہے کہ کہیں یہ اس وقت کے کسی اور خاندان نے اسے اپنے ٹھکانے کے طور پر نہ بسالیا ہو، جو اس کی مداخلت کو برا سمجھیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کسی شیر کا بسیرا یا کسی ریچھ کی غار ہو۔ آخر کار وہ کافی قریب پہنچ کر دیکھتا ہے کہ یہ بالکل خالی ہے، اس میں داخل ہوکر قاعدے سے اس کا معائنہ کرتا ہے، اور فیصلہ کرتا ہے

کہ یہ اس کے موجودہ رہائش گاہ سے کہیں زیادہ موزوں ہے، چنانچہ واپس جا کر اپنے خاندان کو بھی لے آتا ہے۔ آگے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ پہنچ کر اس نئے گھر کو بساتا ہے اور اپنے پرانے گھر سے لائے گئے چند انگاروں یا محض لکڑیوں کی مدد سے آگ جلاتا ہے۔

(ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ پتھر والے زمانے کے انسان آگ جلانے کے لیے کون سے طریقے بروے کار لاتے تھے، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ آگ کا استعمال وہ اپنے ابتدائی دور ہی سے کرتے چلے آئے ہیں؛ کیوں کہ پتھریلی پناگاہوں اور غار والے ٹھکانوں میں آتش دان رکھنے کا عام معمول رہا ہے۔)

سونے کا بستر تیار کرنے کے لیے غالبا خاندان کے بعض افراد گھاس پھوس اکٹھا کرتے ہیں، جب کہ دوسرے قریبی جھاڑیوں میں جا کر درختوں اور جھاڑیوں کی شاخیں کاٹتے ہیں تا کہ اپنے ٹھکانے کے اردگرد ایک دیوار چن سکیں۔ مختلف وحشی جانوروں کے چمڑے کھول کر نئے گھر میں فرش کیے جاتے ہیں، اور اسی طرح دوسرے گھریلو ساز وسامان کو بھی جا بجا کر دیتے ہیں اب ایک خاندان مکمل طور پر سکونت پذیر ہو گیا، اور روزانہ کا معمول ایک دفعہ پھر بحال ہو جاتا ہے۔ مرد خوراک کے لیے جانوروں کا شکار کرتے ہیں، اور عورتیں اس سلسلہ میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں اور کھانے والے پھل میوجات اور جڑی بوٹیاں اکٹھا کرتی ہیں۔ ۲

یہ تفصیلی خاکہ سائنسی انکشافات پر نہیں بلکہ محض مصنف کے اپنے خیالات پر مبنی ہے۔ اصحاب ارتقا اس قسم کی کہانیوں کو مختلف سائنسی اصطلاحات کے لبادے پہنا کر پیش کرتے ہیں اور ہڈیوں کے دو چند ٹکڑوں پر یہ تمام جزیئے گردش کرتے ہیں۔ (درحقیقت یہ حجریے ظاہر کرتے ہیں کہ کسی قسم کا کوئی ارتقائی عمل کبھی واقع نہیں ہوا اور اصحاب ارتقا کے دعوے سراسر بے سند ہیں) بظاہر ہڈیوں کے یہ ٹکڑے کبھی بھی تشفی بخش معلومات فراہم نہیں کر سکتے

کہ قدیم زمانے کے لوگوں کے خیالات وجذبات، روزمرہ کی زندگیاں، اور آپس میں کام کی تقسیم کے سلسلے کیسے تھے۔

تاہم انسانی ارتقا کی کہانی ایسے بے شمار خیالی منظرناموں اور اشاریوں سے بھری پڑی ہے اور اصحاب ارتقا اس کا بھرپور استعمال کرر ہے ہیں۔ نظریہ ارتقا کے آغاز سے لے کر اب تک اس عقیدہ سے نجات کی کوئی امکانی صورت نہ ہونے کے باعث انھوں نے مذکورہ منظرناموں کو مختلف شکلوں میں منظر عام پر لایا۔ ان کا نصب العین اس بات کی توضیح نہیں بلکہ حقائق کو توڑ مروڑ کر لوگوں کو یہ باور کرانا ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں فرسودہ انسان کا تصور رہا ہے۔

اس طرح کے منظرناموں کو پیش کر کے متعدد ارباب ارتقا کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باوجود اپنے دعوؤں کے اثبات میں سرگرداں ہیں۔ اگرچہ ہر نئے انکشاف کی غلط انداز میں تعبیر کی جاتی ہے مگر چند حقائق کے آئینے انھیں بہت واضح طور پر دکھا دیتا ہے۔ ان حقائق میں سے ایک یہ ہے کہ: آدمی اپنی پیدائش کے روز اول ہی سے آدمی ہی رہا ہے۔ ذہانت اور فنی مہارت جیسی صفات تاریخ کے تمام ادوار میں ایک سی رہی ہیں۔ ارباب ارتقا کے دعوؤں کے مطابق ماضی کے لوگ فرسودہ، نیم انسان اور نیم جانور نہیں تھے۔ وہ لوگ ہماری ہی طرح سوچنے اور بولنے والے انسان تھے، انھوں نے فن پارے ایجاد کیے اور ثقافتی واخلاقی معیار کو قائم کیا۔ اور آپ مشاہدہ کریں گے کہ اثریاتی اور حجریاتی دریافتوں نے بلاکسی تضاد کے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔

ہماری اپنی تہذیب کے باقیات کیا ہوں گے
What Will Remain from Our Own Civilization?

ذرا چشم تصور سے دیکھیں کہ سیکڑوں ہزاروں سال پر محیط ہماری آج کی عظیم الشان تہذیب سے کیا باقی رہے گا۔ ہماری جملہ ثقافتی شیرازہ بندی کے فن پارے مثلاً مصوری، مجسّمے اور محلات وغیرہ غائب ہو جائیں گے اور ہماری آج کی موجودہ ٹکنالوجی کا بمشکل کچھ اثر باقی رہے گا۔ اور بہت سے پائیدار مواد آہستہ آہستہ قدرتی طور پر ختم ہونا شروع ہو جائیں گے ، اسٹیل کو زنگ لگ جاتے ہیں، عمارتی مواد سڑ جاتے ہیں، زیر زمین والی سہولیات منہدم ہو جاتی ہیں، اور تمام مواد کے لیے گاہے گاہے مرمت درکار ہوتی ہے۔ اب تصور کریں کہ ہزاروں سال گزر گئے ہیں اور ان پر ہزاروں بار موسلا دھار بارشیں ہوئیں ہیں، صدیوں کے سخت طوفان چلے ہیں، بار ہا سیلاب اور زلزلے آئے ہیں۔ زمانہ ماضی سے جو چیزیں ہمارے ہاتھ لگی ہیں اسی طرح شاید صرف منقش پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے، کانوں سے نکالے گئے عمارتوں کی تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھر اور مختلف مجسّموں کے ٹکڑے باقی رہ جائیں گے۔ اور ہماری روزمرہ کی زندگیوں کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ہماری ان پیش رفتہ تہذیبوں کی بجائے صرف کچھ باقیات مل جائیں جو افریقہ، اسٹریلیا اور دنیا کے کسی اور خطہ کے رہنے والے قبائل کے ہو سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہمارے پاس موجودہ ٹکنالوجی (ٹیلی وژن، کمپیوٹر اور مائیکرو ویو اونز وغیرہ) کا کوئی سراغ نہ مجسّمے رہے بلکہ صرف مجسّمے کے کچھ ٹکڑے شاید باقی رہیں۔ اگر مستقبل کے سائنس داں ان بکھرے ہوئے باقیات کو دیکھ کر ہمارے موجودہ دور کے تمام معاشروں کو ''ثقافتی طور پر پس ماندہ'' قرار دیں گے تو کیا ان کی باتیں حقیقت سے بعید نہیں مانی جائیں گی؟۔

یا اگر کوئی شخص 'مندرین' میں لکھا ہوا کوئی نوشتہ پا کر محض اس کے متن کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالے کہ چین والے ایک پس ماندہ نسل کے مالک تھے جو آپس میں عجیب وغریب اشاروں

کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے۔تو کیا یہ اصل حقائق کی عکاسی کہی جائے گی؟۔

آئیں ذرا آگسٹے روڈن کے مجسّمے ''مفکر'' کی مثال پرغور کرتے ہیں کہ یہ مجسمہ آج سے ہزاروں سال بعد آثار قدیمہ کے ماہرین دریافت کر لیتے ہیں ۔ اب اگر ہمارے معاشرے کی طرزِ زندگی اور عقائد کے بارے میں تاریخی دستاویز سے عاری پہلے سے قائم کردہ اپنے نظریات کو وہ محققین برقرار رکھیں تو ظاہر ہے وہ اس مجسمہ کی ایک جداگانہ انداز میں تعبیر کریں گے۔وہ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کے افراد ایک مفکر انسان کی عبادت کرتے تھے ، یا یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ مجسمہ کسی فرضی جھوٹے دیوتا کی نمائندگی کرتا ہے۔آج ہم یقین سے جانتے ہیں کہ ''مفکر'' محض فنی بنیادوں پر جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے تراشا ہوا ایک مجسمہ ہے۔اگر ایک محقق کے پاس ہزاروں سال کی تاریخ کا کافی علم نہ ہو اور ماضی کے بارے میں قائم کردہ اپنے نظریات پر جما رہے تو ایسی حالت میں اس کے لیے ناممکن ہے کہ وہ حقیقی نتائج تک رسائی حاصل کر سکے کیوں کہ وہ اپنے قائم کردہ نظریے کی روشنی میں ''مفکر'' کی تعبیر پیش کرے گا اور اسی مناسبت سے ایک منظر نامہ گڑھے گا۔اس لیے دستیاب معلومات کا تعصب اور جان داری کی عینک اتار کر جانچ پرکھ کرنا، قائم کردہ نظریات سے اجتناب کرنا اور وسیع تر معنوں میں ان کا تجزیہ انتہائی اہم ہے۔یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ ماضی میں معاشرے فرسودہ تھے یا معاشرے ارتقا کے مراحل سے گزرتے رہتے ہیں ۔یہ تجاویز محض ارتقا کی حمایت کرنے والے ان مورخوں اور ماہرین آثار قدیمہ کے تجزیوں اور قیاس آرائیوں پر مشتمل ہے۔مثال کے طور پر غار کی دیوار پر جانور کی تصویر کشی کو غار والے انسان کی ابتدائی تصویر کشی کے طور پر بے ساختہ منسوب کیا گیا مگر یہ تصاویر اس وقت کے انسانوں کے جمالیاتی ذوق کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتی ہیں۔اپنے وقت کے جدید ترین پوشاک میں ملبوس ان کے کسی فن کار کے محض اپنے فن کارانہ ذوق کی خاطر بنائے جانے کا بھی امکان ہے۔یقینا بہت سے سائنس داں اب اس بات پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں کہ غاروں والی یہ تصویر کشیاں کسی فرسودہ ذہن کی پیداوار کا کرشمہ نہیں ہوسکتیں۔

بندرنماانسان کے بنائے ہوئے تیز کنارے والے پتھروں کے پہلے اوزاروں کی تعبیر سے متعلق ایک دوسری مثال یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت کے لوگوں نے آرائش وزیبائش کی خاطر ان پتھروں کو مشکل و منقش کیا ہو کیوں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ محض ایک مفروضہ ہے کہ ان لوگوں نے ان ٹکڑوں کو اوزار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ نظریہ ارتقا کے سائنس دانوں نے کھدائی کے دوران دریافت شدہ دلیل کی متعصّبانہ نقطہ نظر سے جانچ پڑتال کی ہے اورانھوں نے اپنے مخصوص نقطہ نظر سے اپنے نظریے کے اثبات کے لیے بعض حجریے کے ساتھ کھلواڑ کیا ہے۔ جب کہ دوسرے حجریوں کی یا تو مکمل طور پر تردید کی ہے یا اس سے غفلت برتی ہے۔اس طرح کے کھیل یہ دکھانے کے لیے کھیلے گئے ہیں کہ تاریخ بھی ارتقا کے مراحل طے کرتی ہے۔امریکہ کا ماہرانسانیات ملو یلے ہرسکوویٹس (Melville Herskovits) تاریخ نظریہ ارتقا کے ابھرنے اوراس سلسلہ میں ارباب ارتقا کے دلائل کا پس منظریوں بیان کرتا ہے :

> ثقافتی ارتقا کے ہر جزو نے اس تسلسل کا ایک خیالی خاکہ فراہم کیا جس کی ترجمانی اس نے انسانی ترقی سے کی ہے،اس طرح غیر مستقیم تسلسل کی بہت سی مثالیں درج کی گئی ہیں جن میں سے بعض تسلسل، ثقافت کے ایک پہلو تک محدود تھے۔ ۴

ہرسکوویٹس کے نظریے کی تصدیق کے لیے سب سے اہم مثال ارتقا پسند ماہرنسلیّات لیوس ہنڈری مورگن (Lewis, Henry Morgan) کی تحقیق ہے،اس نے اپنے دعویٰ کے مطابق ابتدائی حالت سے ترقی یافتہ حالت کی طرف ارتقا کرنے والے اس معاشرے کے مختلف مراحل کا معاینہ کیا جس میں سردارانہ یک زوجگی والا مخصوص دستور قائم تھا۔لیکن اپنی تحقیق کو جاری رکھتے ہوئے اس نے دنیا کے آپس میں مکمل طور پر غیر مربوط مختلف معاشروں کی مثالیں استعمال کی ہیں۔ پھراس نے اپنے مطلوبہ نتیجوں کے مطابق ان کو مرتب کیا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ دنیا کی سیکڑوں ہزاروں ثقافتوں میں سے اس نے صرف ان کو منتخب کیا جواس کے اپنے پہلے سے قائم شدہ نظریے کے مطابق تھیں۔

ہرسکوویٹس وضاحت کرتا ہے کہ مورگن نے اپنے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تاریخ کو کس طرح دوبارہ مرتب کیا ہے۔اس نے مادر صلبی ابتدائی اسٹریلین سے شروع کر کے پدر صلبی امریکی انڈین کی طرف ایک خط کھینچا، جب نر والے صلب میں بلا کسی مخصوص یکز وجگی کے اس کی نسل مکمل ثابت ہوئی، تو پھر اس نے اپنے سلسلہ کو ابتدائی دور والی تاریخ گریشن (Grecian) یونانی قبائل کی طرف حرکت دی۔اس کے چڑھنے والے پیمانے کے آخری اندراج نے نر صلب اور مخصوص یکز وجگی والی آج کی تہذیب کی نمائندگی کی ہے۔ ہرسکوویٹس اس طرح اس خیالی سلسلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، لیکن یہ سلسلہ تاریخی نقطہ نظر سے بالکل ہی جھوٹا ہے۔

غاروں کے اندر پیش رفتہ فن

The Advanced Art in Caves

اصحاب ارتقا اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ تقریباً تیس سے لے کر چالیس ہزار سال پہلے یورپ میں اور افریقہ کے نسبتاً اس سے بھی زیادہ پہلے دور میں نام نہاد بندر جیسے انسان یکایک عمل تغیر سے دوچار ہو گئے، اور بالکل آج کے انسانوں کی طرح دفعۃً سوچنے اور چیزیں بنانے کی قابلیت حاصل کر لی۔اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ اس دور کے آثار قدیمہ کی دریافتیں وہ اہم ثبوت پیش کرتی ہیں جس کی نظریہ ارتقا تشریح نہیں کر سکتی ۔ ڈارون کے دعوؤں کے مطابق پتھر والے اوزار کی ٹکنالوجی تقریباً دو لاکھ سال تک بغیر کسی تبدیلی کے برقرار رہی، اور اچانک اس کی جگہ ایک زیادہ ترقی یافتہ اور تیزی سے بڑھتی ہوئی دستکاری والی ٹکنالوجی نے لے لی، نام نہاد فرسودہ انسان جو فرضی طور پر درختوں سے اترا تھا اور دفعۃً پیدا ہونے والی فنکارانہ مہارت کے فوراً بعد اس نے جدت طرازی کا آغاز کر دیا تھا، غاروں کی دیواروں پر انتہائی خوبصورت اور باسلیقہ کشیدہ کاری اور تصویر کشی شروع کر دی، اور انتہائی خوبصورت زیورات مثلاً ہار اور چوڑیاں بنانی شروع کر دیں۔

اس ترقی کا محرک کیا تھا؟ نیم بندر فرسودہ انسانوں نے ایسی فنکارانہ قابلیت کیوں اور

کیسے حاصل کی۔ محض چند نظریات پیش کرنے کے سوا ارباب ارتقا ایسے سوالات کے تشفی بخش جوابات دینے سے قاصر ہیں۔ نظریہ ارتقا کا حامی راجر لیون (Roger Lewin) اپنی کتاب ''The Origion of Modern Humans'' میں خود کو درپیش ڈارون نظریے کی ان مشکلات کو یوں بیان کرتا ہے :

چوں کہ اب تک نامکمل آثار قدیمہ کے دستاویز ذو معنی یا مشتبہ ہیں اس لیے ماہرین ان سوالات کا مختلف جہتوں سے جواب دیتے ہیں۔

تاہم آثار قدیمہ کی دریافتیں ظاہر کرتی ہیں کہ انسان اپنے وجود کے وقت ہی سے ثقافتی تہذیب وتمدن کا حامل رہا ہے۔ گاہے بگاہے اس کی فہم وفراست نے پیش رفت اور پسپائی کی، یا دفعۃً تبدیلیوں سے دوچار ہوئی، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کوئی ارتقائی عمل واقع ہوا ہے بلکہ اس کی بجائے ثقافتی ترقیاں اور تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ فن پاروں کا ظہور جس کی تعبیر ارباب ارتقا ''دفعۃً'' تبدیلی سے کرتے ہیں کسی قسم کی انسانی حیاتاتی ترقی (بالخصوص ذہنی مہارت) کے مفہوم کو ظاہر نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ اس وقت کے لوگ مختلف معاشرتی تبدیلیوں سے ہو کر گزرے ہوں اور ان کی فنکارانہ اور تخلیقی سمجھ بوجھ کسی تغیر سے ہمکنار ہوئی ہو لیکن یہ بات فرسودہ انسان کے جدید انسان میں بدل جانے کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کرسکتی۔ گزشتہ لوگوں کے چھوڑے ہوئے باقیات اور ارباب نظریہ ارتقا کے مطابق باقی رہ جانے والے تشریحی وحیاتیاتی باقیات کے درمیان اختلاف ایک دفعہ پھر اس موضوع پر ڈارون کے دعوؤں کو باطل قرار دیتا ہے۔

(ڈارونزم کے بنیادی دعویٰ انسانی شجرہ نسب کے نظریے کی سائنسی طور پر تردید کرنے والے تفصیلی ثبوت کے لیے ہارون یحییٰ کی کتاب ''Darwinism Refuted'' کا مطالعہ آپ کے لیے سودمند ثابت ہوگا)

ارباب ارتقا دعوی کرتے ہیں کہ انسانی ثقافتی ترقی براہ راست اس کی حیاتیاتی ترقی کی متناسب رہی ہوں گی۔ مثال کے طور پر پہلے دور کے انسان نے اپنے جذبات کی ترجمانی کچھ سادہ تصویر کشی کے ذریعہ کی ہوگی، پھر ان کو مزید ترقی دی یہاں تک کہ آہستہ آہستہ یہ ترقی

بالآخر فنکارانہ عروج تک پہنچ گئی ہوگی۔ تاہم انسانی تاریخ کے ابتدائی فنکارانہ باقیات اس مفروضے کو بالکل ہی غلط ثابت کردیتے ہیں۔ غاروں والی تصویرکشیاں، کندہ کاریاں اورابھرے نقوش عام طور پرفن کی ابتدائی مثالیں تصور کی جاتی ہیں اور یہ سب اس دور کے انسان کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق کی غمازی کرتی ہیں۔ غاروں پر اپنی تحقیقی نظر رکھنے والے سائنس دان ان تصویروں کو تاریخ فنون لطیفہ کے انتہائی اہم اور گراں قدرفن پارے تصور کرتے ہیں۔ جن میں سایوں، پس منظراور باریک لکیروں کا استعمال ان ابھرویں نقوش میں منعکس گہرے جذبات کی ماہرانہ عکاسی کرتا ہے نیز وہ جمالیاتی نقوش جوان کندہ کاریوں پرسورج کی کرنیں پڑنے سے چمکتے دمکتے ہیں۔ یہ سب وہ خصوصیات ہیں جن کی توضیح سے ارباب ارتقا قاصر ہیں کیوں کہ ڈارون کے نظریے کے مطابق اس طرح کی ترقی بہت بعد میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔

فرانس، اسپین، اٹلی، چین، ہندوستان، افریقہ کے بعض خطوں اور دنیا کے دوسرے مختلف علاقوں میں دریافت ہوئیں غاروں کی بہت سی تصویرکشیاں قدیم انسانی ثقافت کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتی ہیں۔ ان تصویرکشیوں میں استعمال ہونے والے رنگ اورطرز ایسے معیاری ہیں جو محققین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح ڈارون نظریہ رکھنے والے سائنس داں ان کو اپنے تعصّبانہ انداز سے پرکھتے ہیں، اوران فن پاروں کی جانب دارانہ انداز سے ترجمانی کرتے ہیں تاکہ وہ ان کے وضع کردہ خیالی ارتقائی کہانیوں کے چوکھٹے میں صحیح اترسکیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مخلوق جب انسان بن گئی، تواس نے ان جانوروں کی تصویرکشی کی جن سے یہ ڈرتے یاان کا شکارکرتے تھے، اوریہ کام انھوں نے غاروں میں رہنے والی زندگی کی بالکل ابتدائی حالت میں کیا، مگران فن پاروں میں استعمال شدہ طریقہ ہائے کار دکھاتے ہیں کہ ان کے فن کار بہت گہری سمجھ بوجھ کے مالک تھے اوروہ ان کوانتہائی موثر طریقے سے اجاگرکرنے کے قابل تھے۔ تصویرکشی میں استعمال شدہ طریقہ ہائے کار یہ بھی دکھاتے ہیں کہ انھوں نے ابتدائی حالات پر مشتمل کوئی زندگی نہیں گزاری ہے مزید برآں غار کی دیواروں پر یہ تصویریں اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ اس

وقت کے لوگ ان غاروں ہی میں رہتے تھے کیوں کہ ایسا ممکن ہے کہ یہ فن کار کسی نمایاں پنا گاہ میں رہتے رہے ہوں لیکن تصویر سازی کے لیے انھوں نے غاروں کی دیواروں کا انتخاب کیا ہو۔ اس انتخاب کی طرف لے جانے والے جذبات وخیالات کا علم محض ان فن کاروں ہی کو ہے۔ ان تصویر کشیوں کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں جس کی سب سے زیادہ بعد از حقیقت ترجمانی یہ ہے کہ یہ فرسودگی کی زندگی بسر کرنے والے انسانوں کے بنائی ہوئی ہیں۔ ۲۲ر فروری-۲۰۰۰ء-کو بی بی سی (B.B.C) کے سائنسی ویب پیج پر شائع ہونے والی رپورٹ غاروں والی تصویر کشی کے بارے میں درج ذیل جملوں پر مشتمل تھی :

> ۔۔۔ہمارا خیال تھا کہ یہ ان فرسودہ لوگوں نے بنائے تھے۔۔۔لیکن جنوبی افریقہ میں کام کرنے والے ان دو سائنس دانوں کے مطابق قدیم مصوروں کا یہ نظریہ مکمل طور پر غلط ہے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ تصویر کشیاں ایک جدید اور مرکب معاشرے کا ثبوت ہے۔ ۱۰

اگر دورِ جدید کے بہت سے فن کاروں کا ہزاروں سال بعد اسی طرح کی منطق سے تجزیہ کیا جائے تو بہت سی اختلافی بحثیں سر اٹھا سکتی ہیں کہ اکیسویں صدی کا معاشرہ ایک ابتدائی قبائلی معاشرہ تھا یا ایک پیش رفتہ تہذیب کا مالک۔ اگر آج کے فن کاروں کی بنائی گئی تصویریں کوئی پانچ ہزار سال بعد اپنی محفوظ شکل میں دریافت ہوں اور آج کے بارے میں کوئی تحریری دستاویز بھی باقی نہ ہو تو مستقبل کے لوگ ہمارے اس دور کے بارے میں کیا سوچیں گے؟۔

اگر مستقبل کے لوگ وان گوخ (Vangogh) یا پیکاسو (Picasso) کے شہ پاروں کی دریافت کر لیں اور ارتقائی نقطہ نظر سے ان کا جائزہ لیں تو آج کے معاشرہ کا تصور ان کے تئیں کیا ہوگا؟۔ کلاڈے مونیٹ (ClaudeMonet) کے خشکی کے مناظر اس قسم کی تشریحات کو ابھاریں گے کہ جیسے صنعتوں نے ابھی کچھ ترقی نہ کیا تھا اور لوگ کھیتی باڑی والی زندگی گزارتے تھے۔ یا ویسلی کاندنسکی (Wassily Kandinsky) کی تصاویر اس قسم

کی ترجمانیاں کریں گی کہ لوگ ابھی تک لکھنے پڑھنے کے قابل نہ تھے اور آپس میں اشاروں کنایوں سے ہم کلام ہوا کرتے تھے ،توکیا اس قسم کی تعبیریں ان کو ہمارے آج والے معاشرے کی کوئی سچی بصیرت پیش کرسکیں گی؟۔

قدیم تہذیبوں کے تعجب خیز باقیات
Astonishing Remains of Ancient Civilizations

اگست کومٹے **(August Comte)** ہربرٹ اسپنسر **(Herbert Sperncer)**، اور لیوس ہینڈر مورگن **(Lewis Henry Morgien)** جیسے نظریہ پسندوں نے اپنے مختلف ادوار میں معاشی اور ثقافتی ارتقا کا غلط نظریہ پیش کیا اور بعد میں اس کو چارلس ڈارون کے نظریے کے ساتھ ملا دیا جو بتا تا ہے کہ تمام معاشرے ابتدا ہی سے ترقی یافتہ تہذیب کی طرف ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ یہ غلطی انیسویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوئی اور پہلی جنگ عظیم کے بعد اس کے اثرات روز افزوں ہو گئے، اس نے نسل پرستی، نوآبادیاتی نظام اور نسلی اصلاحیات کی سفاکانہ تحریک کی فرضی سائنسی بنیاد فراہم کی۔ مختلف جسمانی، رنگی اور ثقافت رکھنے والے دنیا میں آباد معاشروں کے ساتھ اسی غیر سائنسی مفروضے کے تقاضے کی بنیاد پر غیر انسانی سلوک کیا گیا۔

آدم فرگوسن **(Adam Fergosun)**، جون میلر **(John Millar)**، آدم اسمتھ **(Adam Smith)** جیسے مصنفوں اور مفکروں نے تجویز کیا ہے کہ تمام معاشرے ارتقا کے چار بنیادی مراحل سے گزر چکے ہیں: شکار اور اندوختگی، چرواہانہ زندگی اور خانہ بدوشیت، زراعت اور آخر کار تجارت۔ اصحاب ارتقا کے دعوؤں کے مطابق فرسودہ انسان جب بندر والے خول سے نکل گیا تو اپنے سادہ ترین اوزار سے اس نے شکار کرنا شروع کیا، اور وہ پھل پودوں کو چن کر جمع کرتا تھا، جوں جوں ان کی قابلیت اور ذہانت بڑھتی گئی انھوں نے مویشیوں اور بھیڑ جیسے چرنے والے جانوروں کو گھروں میں پالنا پوسنا شروع کیا

،ان کی ذہانت وقابلیت آخر کار اس نقطہ تک ترقی کر گئی کہ وہ زراعت کا کام کرنے کے قابل ہو گئے اور انجام کار تجارت اور تبادلہ اموال شروع کر دیا۔

تاہم علم آثار قدیمہ، علم انسانیات اور سائنس کے دوسرے شعبوں کی پیش قدمیوں اور حالیہ انکشافات نے ''ثقافتی اور معاشی ارتقا'' کے قصے والے اس بنیادی دعوے کو باطل قرار دیا ہے۔ یہ دعوے محض وہ مادہ پرستانہ کوششیں ہیں جن میں انسانوں کی غیر معقول وحشیوں سے ارتقا کی تصویر پیش کی گئی ہے اور سائنس پر یہ قصہ عائد کیا گیا ہے جس پر وہ فلسفیانہ وجوہ کی بنا پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

انسان کا شکار کرنا اور زراعت کرنا اس کے ذہنی پس ماندگی یا ترقی کی کوئی دلیل نہیں بن سکتی۔ بالفاظِ دیگر کوئی معاشرہ شکار اس وجہ سے شروع نہیں کرتا کہ وہ پس ماندہ اور ذہنی طور پر بندروں سے قریب تر ہے۔ کاشت کاری کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اس معاشرے نے خود کو فرسودگی سے کنارہ کش کر دیا ہے۔ معاشرے کی کسی کاروائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے باشندے دوسری جاندار چیزوں سے گزر کر آئے ہیں۔ ایسی کاروائیاں کسی مبینہ ارتقائی عمل کے نتیجہ میں ایسے افراد پیدا نہیں کرتیں جو ذہانت وقابلیت میں زیادہ ترقی یافتہ ہوں۔ ٹکنالوجی کے اعتبار سے آج کل کے بہت سے پس ماندہ قبائل محض شکار اور اندوختگی میں مصروف ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ درجہ انسانیت سے گرے ہوئے ہیں۔ یہی اصول مستقبل میں ہزاروں سال کے بعد زندگی پانے والے انسانوں پر بھی نافذ ہوگا جیسا کہ یہ ان سیکڑوں ہزاروں سال پہلے زندگی بسر کرنے والوں پر ہوتا ہے۔ موخرالذکر فرسودہ انسان نہیں تھے اور نہ مستقبل والے کوئی ترقی یافتہ نوع کے حامل گردانے جائیں گے۔

معاشروں کے طرز ہائے زندگی پر مبنی تہذیبوں کی ارتقائی تاریخ کی ساخت ایک غیر سائنسی سوچ ہے۔ اس پس منظر کی بنیاد ان سائنس دانوں کے مادہ پرستانہ تعصب کے مطابق مختلف آثار قدیمہ کی دریافتوں کی ترجمانی ہے جو یہ فرض کرتے ہیں کہ پتھر کے اوزار استعمال کرنے والے انسان بندر نما انسان تھے جو بھنبھناتے، دوزانو بیٹھتے اور جانوروں کی سی خصلتیں اپنائے ہوئے تھے، مگر کوئی ایسی باقیات دریافت نہیں ہوئیں جو اُن لوگوں کی ذہنی

صلاحیتوں کی بابت معلومات فراہم کرتی ہوں۔ یہ سب کچھ محض قیاس آرائیاں ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اگر آج کے فن پاروں کی مختلف مثالیں ایک لاکھ سال بعد دریافت ہو جائیں اور مستقبل کے لوگوں کے پاس اس سلسلہ میں مزید کوئی معلومات نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ آج کی انسانیت اور ہماری ٹکنالوجی کے بارے میں یقیناً مختلف قسم کی تعبیریں پیش کریں گے۔

جیسا کہ ہم نے ارتقا کرنے والے معاشرے کے نظریے کے سلسلہ میں دکھایا کہ اس کی بنیاد کسی بھی سائنسی شہادت پر نہیں بلکہ اس نظریے کی بنیاد اس غلط اور غیر سائنسی نظریے پر ہے کہ انسان بنیادی طور پر بندر نما ذہنیت رکھتا تھا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کا ارتقا پسند اور ماہر انسانیات ولیم ہوولس (William Howells) تسلیم کرتا ہے کہ ارتقا کا نظریہ بدن کے بارے میں نہیں بلکہ رویے کے بارے میں دوسرے سوالوں کو جنم دیتا ہے، اور اس کا تعلق فلسفے سے ہے جو مشکل تر سائنسی حقائق کا تعین کرتا ہے۔ ہوولس بتاتا ہے کہ اس مفہوم میں انسانی خصلت کسی ''حجریے'' کی شکل اختیار نہیں کرتی جس طرح کہ انسانی کھوپڑی کرتی ہے، اور یہ پتھر والے اوزار کی طرح باقی نہیں رہتی، اس لیے زمانہ قدیم کے واقعات کے بارے میں بہت کم معلومات میسر آتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی ذکر کرتا ہے کہ ایسے مفروضوں کی جانچ بھی ناممکن ہے۔

حال ہی میں معاشی سائنس دانوں کی اکثریت نے نظریہ ارتقا میں پائی جانے والی غلطیوں کو تسلیم کرتے ہوئے دوٹوک بیان کیا ہے کہ معاشی ارتقا والا نظریہ درجہ ذیل نکات پر سائنس کے ساتھ مزاحم ہے :

[۱] یہ نسلی امتیاز سے کافی حد تک مربوط ہے کہ مختلف معاشروں کی متعصّبانہ انداز میں ترجمانی کی جائے مثلاً یہ مفروضہ کہ مغربی معاشرے زیادہ مہذب ہیں۔

[۲] یہ تجویز کرتا ہے کہ یہ تمام معاشرے ایک ہی راستے، ایک جیسے طریقہ ہائے کار اور یکساں مقاصد کے حامل تھے۔

[۳] یہ معاشرے کو مادہ پرستانہ تناظر میں دیکھتا ہے۔

[۴] یہ ان دریافتوں سے کوئی خاص مطابقت نہیں رکھتا ہے۔فرسودہ حالات میں زندگی گزارنے والے بہت سے معاشرے جدید سمجھے جانے والے معاشروں سے زیادہ مہذب روحانی اقدار رکھتے ہیں۔بالفاظ دیگر وہ عمل پسند ہیں اور معیار کو ترجیح دیتے ہیں ،اپنی غذاؤں کی وجہ سے وہ زیادہ صحت منداور قوی تر بھی ہیں۔

جیسا کہ یہ نکات واضح طور پر دکھاتے ہیں کہ فرسودہ معاشرے سے لے کر مہذب معاشرے تک ترقی کرنے والے معاشرے ان سائنسی اقدار و حقائق سے مطابقت نہیں رکھتے۔اس نظریے کی بنیاد ان تعبیروں پر ہے جو مادہ پرستانہ نظریے کے زیر اثر توڑ مروڑ دی گئی ہیں۔گزشتہ تہذیبوں کے فن پارے اور باقیات ''تاریخ اور ثقافت کی ارتقا'' والے فریب کی غلطیوں کو واشگاف کرتے ہیں۔

سابقہ پرفریب ارتقا کی نشانیاں

Traces of the Past Refute Evolution

گزشتہ تہذیبوں کی دریافتیں'' فرسودہ معاشرے سے مہذب معاشرے تک ترقی '' کے نظریہ کی تردید کرتی ہیں۔جب ہم تاریخ کے تسلسل کو دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہے کہ انسان ہمیشہ ذہانت اور مہارت سے آراستہ رہا ہے،سیکڑوں ہزاروں سال قبل لوگوں نے جو فن پارے بنائے اور جو نشانیاں چھوڑی وہ معنوی طور پر ارباب ارتقا کے دعوؤں کے بالکل خلاف ہیں۔جب ہم ان نشانیوں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ گزشتہ ادوار میں لوگوں نے اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کے ساتھ نئی نئی دریافتیں کی ہیں نیز اپنی ضرورتوں کی تکمیل اور تہذیبوں کی تعمیر بھی کی ہے۔

مبعوث پیغمبروں نے بڑی تبدیلیوں کے آغاز کی وساطت سے اپنے عوام کی تعمیر و ترقی میں بھرپور تعاون کیا ہے ۔ وحی الٰہی کی برکت سے وہ تفصیلی سائنسی علم سے مالا مال تھے۔مثال کے طور پر حضرت نوح -علیہ السلام-کشتی سازی کی ٹکنالوجی سے باخبر تھے۔کیوں کہ قرآن کے حوالے سے ہمیں پتا ہے کہ کشتی نوح بھاپ کی قوت سے چل

رہی تھی۔(واللہ اعلم بالصواب)

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور تنور اُبلا ہم نے فرمایا کشتی میں سوار کر لے ہر جنس میں سے ایک جوڑا نر و مادہ اور جن پر بات پڑ چکی ہے ان کے سوا اپنے گھر والوں اور باقی مسلمانوں کو، اور اس کے ساتھ مسلمان نہ تھے مگر تھوڑے۔(سورۂ ہود؛ ۱۱/ ۴۰)

'تنور' آج بھی مختلف علاقوں میں استعمال کیا جاتا ہے، آیت میں بیان ہوتا ہے کہ یہ تنور زور سے پانی نکالتا تھا، اس طرح یہ کشتی بھٹی کے بخارات کی حرکت پر یا بالفاظ دیگر انگیٹھی کے جوش کے ذریعہ رواں دواں تھی۔ المالی کا ہم دھی یزیر اپنی تفسیر میں لکھتا ہے :

یہ ''اسٹو کے ذریعہ حرکت پیدا کرنے والی بھاپ'' سے چلنے والی ایک قسم کی دخانی کشتی تھی ۔ تنور لغت میں بند انگیٹھی یا چولہے کو کہتے ہیں۔لفظ فار کا مطلب جوش دینا، اور پوری قوت وشدت کے ساتھ پھوٹ نکلنا ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں ہوسکتی ہے کہ وہ کشتی بادبانی نہیں تھی بلکہ انگیٹھی کے ذریعہ حرکت کرنے والی کوئی دخانی کشتی کی سی تھی۔ ۳۷

حضرت سلیمان – علیہ السلام – کے دور میں بھی سائنس، فن اور ٹکنالوجی میں بہت سی ترقیاں وقوع پذیر ہوئیں، قرآن اتنشالا بیان کرتا ہے کہ ان کے دور میں جہاز جیسی تیز نقل وحمل والی گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں۔

اور سلیمان کے بس میں ہوا کر دی اس کی صبح کی منزل ایک مہینہ کی راہ اور شام کی منزل ایک مہینہ کی راہ۔(سورۂ سبا؛ ۳۴/ ۱۲)

یہ آیت واضح طور پر نشان دہی کرتی ہے کہ لمبے فاصلے جلدی سے کیسے طے کیے جاتے تھے، یہ عصر حاضر میں استعمال کی جانے والی بادبانی گاڑیوں میں استعمال ہونے والی ٹکنالوجی کو دکھاتی ہے۔(واللہ اعلم بالصواب)

مزید برآں قرآن بتاتا ہے :

اس کے لیے بناتے جو وہ چاہتا اونچے اونچے محل اور تصویریں اور بڑے حوضوں کے برابر لگن اور لنگر دار دیگیں، اے داؤد والو! شکر کرو اور میرے بندوں میں کم ہیں شکر

والے۔(سورۂ سبا؛۳۴/۱۳)

بالفاظ دیگر حضرت سلیمان-علیہ السلام-نے اپنے کاریگروں کو تعمیراتی ٹکنالوجیوں اور عالی شان طرز تعمیر کے استعمال کی ہدایت جاری فرمائی، ایک دوسری آیت بتاتی ہے :

تو ہم نے ہوا اس کے بس میں کردی کہ اس کے حکم سے نرم نرم چلتی جہاں وہ چاہتا۔
اور دیو بس میں کردیے ہر معمار اور غوطہ خور۔(سورۂ ص؛۳۸/۳۶،۳۷)

یہ حقیقت کہ حضرت سلیمان -علیہ السلام-غوطہ خور شیطانوں پر قبضہ رکھتے تھے، جو زیر سمندر وسائل کے اخراج اور اس کے مقام کے تعین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔زیر سمندر تیل اور گراں مایہ دھاتوں کے اخراج کے طریقہ کار اور عمل کے لیے ایک بہت ہی اعلیٰ قسم کی ٹکنالوجی درکار ہوتی ہے۔یہ آیتیں اس بات کی تاکید کرتی ہیں کہ اس قسم کی ٹکنالوجی اس وقت موجود اور زیر استعمال تھی۔

ایک دوسری آیت بتاتی ہے :

اور ہم نے اس کے لیے لوہا نرم کردیا۔کہ وسیع زرہیں بنا اور بنانے میں اندازے کالحاظ رکھ اور تم سب نیکی کرو بے شک تمہارے کام دیکھ رہا ہوں ۔(سورۂ سبا؛۳۴/۱۰،۱۱)

پگھلے تانبے کا استعمال اس وقت کی اعلیٰ ٹکنالوجی کے وجود کو ظاہر کرتا ہے کہ حضرت سلیمان -علیہ السلام-کے دور میں بجلی کا استعمال ہوتا تھا ،جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تانبا حرارت ،اور بجلی کا بہترین موصل ہے، اس کی وجہ سے یہ بجلی کی صنعت کے لیے اساس کا کام دیتا ہے۔یہ اصطلاح کہ 'ہم نے اس کے لیے لوہا نرم کردیا' بجلی کی بڑی مقدار تک پیدا کیے جانے اور بہت سے ٹکنالوجی والے میدانوں میں اپنے پورے قرائن کے ساتھ اس کے استعمال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔(واللہ اعلم بالصواب)

چند آیتیں دکھاتی ہیں کہ حضرت داؤد-علیہ السلام-کو لوہے کے کام اور زرہیں بنانے کا بہترین علم تھا :

اور ہم نے اس کے لیے لوہا نرم کردیا۔کہ وسیع زرہیں بنا اور بنانے میں اندازے

کا لحاظ رکھ اور تم سب نیکی کرو بے شک تمہارے کام دیکھ رہا ہوں ۔(سورۂ سبا؛۳۴/۱۰،۱۱)

قرآن یہ بھی ذکر کرتا ہے کہ ذوالقرنین نے دو پہاڑوں کے درمیان ایک ایسا بند باندھ دیا جس کو اس وقت کے لوگ نہ پار سکے اور نہ اس میں سوراخ کر سکے،متعلقہ آیت کے مطابق اس نے اس مقصد کے لیے لوہے کی اینٹ اور پگھلے ہوئے تانبے کو استعمال کیا :

(ذوالقرنین بولے) میرے پاس لوہے کے تختے لاؤ یہاں تک کہ وہ جب دیوار دونوں پہاڑوں کے کناروں سے برابر کردی،کہا دھونکو یہاں تک کہ جب اسے آگ کر دیا کہا لاؤ میں اس پر گلا ہوا تانبہ انڈیل دوں۔(سورۂ کہف؛۱۸/۹۶)

معلومات بتاتی ہیں کہ ذوالقرنین نے مضبوط ترین کنکریٹ والی ٹکنالوجی کو استعمال کیا تھا۔(آپ کو معلوم ہے کہ) لوہا تعمیر میں استعمال ہونے والا ایک مضبوط ترین مواد ہے،اور یہ عمارتوں ، پلوں اور بندوں جیسے تعمیراتی کاموں کی قوت کو بڑھانے کے لیے ناگزیر ہے ۔اس آیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے لوہے کے ایک سرے کو دوسرے سرے سے ملا کر اور اس کے اوپر چونا ڈال کر ان کا کنکریٹ والا ایک پختہ تر اور مضبوط ترین ساخت بنایا۔(واللہ اعلم بالصواب)

قدیم شمالی امریکہ سے حاصل کیے گئے امریکی تہذیب کے کتبے ایک لمبے داڑھی اور سفید عبا پوش انسان کی آمد کا حوالہ دیتے ہیں نیز وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ کوئی تھوڑے سے عرصہ میں ایک خدا پر عقیدہ پھیل گیا اور فن اور سائنس میں دفعتہً پیش رفت رونما ہوئی۔

حضرت یعقوب، یوسف ،موسیٰ اور ہارون-علیہم الصلوٰۃ والسلام- جیسے بہت سے پیغمبر قدیم مصر میں روانہ کیے گئے تھے،ان پیغمبروں اور ان کے ساتھ اہل ایمان نے مختلف ادوار میں مصر کے اندر تیزی سے رونما ہونے والی سائنسی اور فنی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔

قرآن اور سنت محمدی کے پیروکار مسلمان سائنس دانوں نے فلکیات ،ریاضیات، ہندسہ،طبابت اور دوسرے علوم میں اہم انکشافات کیے ہیں جن سے سائنس اور معاشی زندگی

میں ممکنہ اہم ترقی اور بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ان میں سے بعض مسلمانوں کا ذکر ان کے کارناموں کی روشنی میں درج ذیل ہے :

عبد اللَّطيف البغدادي: علم انشراح پر اپنے کارناموں کے لیے مشہور ہے۔ انھوں نے نچلے جبڑے اور سینے والی ہڈیوں کی طرح بدن انسانی کی بہت سی ہڈیوں کے بارے میں گزشتہ غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔اس کی کتاب ''الإفادة و الاعتبار''-۱۷۸۸ء-میں شائع ہوئی۔اور لاطینی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

اس نے اپنی کتاب ''مقالة في الحواس'' (Makalatun Fi Al Hawas) میں پانچ اعضائے حسیہ پر تحقیق کی۔

ابن سینا : (Abicenna) نے بہت سی بیماریوں کا طریقہ علاج ایجاد کیا ہے۔اس کی مشہور کتاب ''القانون في الطب' عربی زبان میں لکھی گئی تھی،اور بارہویں صدی کے اندر لاطینی زبانی میں اس کا ترجمہ ہوا۔سترہویں صدی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں یہ نصاب کی بنیادی کتاب سمجھ کر پڑھائی جاتی تھی۔اس کی طبی تحقیق آج تک کام میں لائی جاتی ہے۔

زکریا القزوینی : نے ارسطو کے وقت سے دماغ اور دل کے بارے میں صحیح باور کیے جا رہے بہت سے غلط نظریات کو ختم کر دیا ہے۔ان دو عضوؤں کے بارے میں فراہم کردہ اس کی معلومات عصر حاضر کے علم سے کافی حد تک مشابہ ہیں۔

زکریا القزوینی، حمد اللّٰہ مستوفی قزوینی (۱۲۸۱ تا ۱۳۵۰) اور **ابن النفیس** نے علم تشریح پر تحقیق کی اور جدید طبی سائنس کی بنیاد رکھی۔

علی ابن عیسیٰ : نے آنکھ کی بیماریوں پر تین جلدوں پر مشتمل ایک کتاب '' تذكرة الكحلين'' (Tazzkiratul Al kahlin) لکھی پہلی جلد مکمل طور پر آنکھ کی تشریح کے لیے مخصوص ہے،اور بہت سے گراں مایہ معلومات پر مشتمل ہے،بعد میں اس کا ترجمہ لاطینی اور جرمن زبانی میں کیا گیا۔

البیرونی: نے جلیلو (galalio) سے چھ سوسال پہلے یہ ثابت کیا کہ زمین گھومتی ہے، اور نیوٹرن سے سات سوسال پہلے اس کے قطر کی پیائش بھی کی۔

علی قشجی: نے چاند کے مراحل پر تحقیق کی اور اسی موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی، اس کی تحقیق آئندہ نسلوں کے مشعل راہ بن گئی۔

ثابت ابن قرا: نے نیوٹن سے صدیوں پہلے احسابے تفریقی کی دریافت کی۔

البتانی: کے فلکیاتی مشاہدات کی باریکیوں نے آنے والے سائنس دانوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا، اس نے پانچ سوتینتیس ستاروں کا مشاہدہ کیا، اور زمین سے سورج کے دورترین مسافت کی صحیح پیائش کی علم مثلث پر اس کی تحقیقات اور پیائشوں نے اس کو ریاضیات کا بانی بنا دیا۔

ابوالوفا: نے ٹگنومیٹری کے لیے خط قاطع (Secant) اور قطع التمام (Cosecant) کی اصطلاحات حاصل کرنے کا شرف حاصل کیا۔

الخوارزمی: نے الجبرا پر سب سے پہلی کتاب لکھی۔

المغربی: نے اپنی کتاب "تحفة العادة" میں تکون، چوگوشے، اور دائرے پر مشتمل جیومیٹری کے اشکال کے سطحی دائرے کی پیائش کے طریقے دریافت کیے۔

ابن الہیثم: علم بصریات کے بانی ہیں۔ بیکن اور کیپلر نے ان کی کتابوں کا استعمال کیا ہے، گلیلو نے دوربین کی دریافت میں ان کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

الکندی: نے آئن سٹائن سے ایک لاکھ ایک سوسال قبل نظریہ ضیافت پیش کیا۔

اک شمس الدین: نے اٹلی کے ماہر طبیعیات فرکیسٹورو (Fracastoro) سے سوسال پہلے پہلی دفعہ جرثوموں کے وجود کو ثابت کیا تھا۔ اگرچہ فرکیسٹورو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے جرثوموں کا متعارف کروایا تھا۔

علی ابن عباس المجوسی: اپنی کتاب "كامل الصناعة الطبية" کے حوالے سے طبی سائنس کا بانی تھا۔ اور اس کی کتاب بہت سی بیماریوں کے علاج میں بنیادی حوالے کی کتاب سمجھی جاتی تھی۔

ابن الجزار : نے جزام کے علاج اوران کی وجوہات کا تذکرہ کیا ہے۔

سائنس دانوں کی ایک لمبی فہرست میں سے صرف چند ہی کے تذکرہ پر ہم نے اکتفا کیا ہے ۔ سچی بات یہ ہے کہ مسلمان سائنس دانوں نے بہت سی عظیم دریافتیں کیں ہیں، اور تعلیمات قرآنی اورسنت نبوی کی اتباع میں جدید سائنس کی بنیادرکھی ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ سابقہ بہت سے لوگوں نے فن ،طبابت، ٹکنالوجی اور سائنس کے میدانوں میں اپنے مبعوث پیغمبروں کی وساطت سے ترقی کی ہے۔پیغمبروں کی فرماں برداری، ان کی تجاویز پرعمل پیرائی ،اوران کی حوصلہ افزائی سے انھوں نے نہ صرف دولت علم حاصل کیا بلکہ اسے کامیابی کے ساتھ آئندہ نسلوں تک منتقل بھی کردیا۔مزید برآں وہ معاشرے جوبعض اوقات دین برحق سے برگشتہ ہوئے اور وہم پرستانہ عقائد اپنانے لگے، ان پیغمبروں کی وساطت سے وہ ایک خدا کی توحید کی طرف پلٹ آئے۔جب ہم تعصب کی عینک اتارکرگزشتہ ادوار سے متعلق دریافتوں پرغورکرتے ہیں تو انسانی تاریخ بڑی وضاحت اورواشگاف انداز میں نکھرکرہمارے سامنے آجاتی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ پس ماندہ اورترقی یافتہ معاشرے آج کی طرح تاریخ کے تمام ادوار میں دوش بدوش رہے ہیں۔عصر حاضر میں ایک طرف ہم خلائی ٹکنالوجی سے مستفیض ہورہے ہیں تو اسی دنیا کے دوسرے گوشے میں لوگ خط فرسودگی سے گری ہوئی زندگی گزار رہے ہیں۔اس طرح ماضی میں قدیم مصر کے اندر ایک طرف پرشکوہ تہذیب موجودتھی تو دوسری طرف دنیا کے دوسرے حصہ میں نسبتاً زیادہ پس ماندہ معاشرے بھی موجود تھے۔میان (Mayan) نے انتہائی ترقی یافتہ شہروں کی تعمیر کی تھی،اوران کی پیچھے چھوڑی ہوئی نشانیوں سے آشکار ہوتا ہے کہ ان کے پاس واضح طور پرجدیداورترقی یافتہ ٹکنالوجی موجودتھی۔انھوں نے زہراسیارے کے مدارکی پیمائش کی اورمشتری سیارے کے چاندوں کودریافت کیا،تواسی زمانے میں یورپ کے بہت سے علاقوں میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ زمین شمسی نظام کا مرکز ہے۔جب اہل مصر دماغ کی جراحی بڑی کامیابی سے کررہے تھے،تو دوسرے علاقوں میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ یہ بیماریاں فرضی بدروحوں کی وجہ سے آتی

ہیں۔سومیرین (Sumerains) نے اپنے قانونی نظام، ادبیات فن کی فہم وفراست اور فلکیاتی علم کے ساتھ میسوپوٹیمیا (Mesopotemia) میں ایک دیرپا اور دوررس اثرات چھوڑنے والی تہذیب کی بنیاد رکھی، جب کہ دنیا کے دوسرے گوشے میں ایسے معاشرے موجود تھے جو ابھی تک ناخواندہ تھے،اس لیے جس طرح آج کی جملہ تہذیبیں ترقی یافتہ نہیں ہیں اسی طرح ماضی میں بھی کوئی ایسا وقت نہیں گزرا ہے کہ محض پس ماندہ ہی پس ماندہ معاشرے موجود رہے ہوں۔

یہاں تک ہم نے تاریخ کے مختلف ادوار سے متعلق شہادتوں کا مطالعہ کیا اور سیکڑوں ہزاروں سال پرانی ثقافتوں کی مثالوں کا جائزہ لیا،اب اگر ہم حالیہ تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ہمارا اس ثبوت دے دوبارہ واسطہ پڑتا ہے کہ انسان ہمیشہ سے انسان ہے۔یہاں ہم فرسودہ لوگوں سے معاملہ نہیں کر رہے ہیں جنھوں نے حال ہی میں اپنے راستے بندروں سے الگ کیے ہوں بلکہ ہمارا واسطہ ان مہذب لوگوں سے ہے جن کو دیکھا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسی تہذیب کی میراث پائی ہے جوان سے ہزاروں سال برقرار رہ چکی ہے۔

جوں جوں بیسویں صدی میں ٹکنالوجی ترقی کرتی گئی توں توں آثار قدیمہ کی تحقیق نے بھی زور پکڑا،اور سچی انسانی تاریخ کے متعلق زیادہ سے زیادہ ثبوت منکشف ہونے شروع ہوگئے، اس طرح یہ حقیقت ابھر کر سامنے آگئی کہ مصر، مرکزی امریکہ،میزوپوٹیمیا اور دوسرے علاقوں میں ہزاروں سال پہلے بہت سے طریقوں میں وہ ہماری طرز زندگی کے متوازن ومساوی تھے۔

میگالث : انسانی تاریخ کے حیران کن فن پارے

Megaliths: Astonishing Artifacts from Human History

پتھر کی بڑی بڑی سلوں پر مشتمل یادگاریں میگالث کے نام سے جانی جاتی ہیں۔بہت سے قدیم میگالث آج تک باقی ہیں،ان یادگاروں کا انتہائی حیران کن پہلو یہ

ہے کہ ایک ٹن سے بھی زیادہ وزن والے پتھر کے یہ بڑی بڑی سلیں مطلوبہ تعمیرات میں کس طرح استعمال کی گئیں۔کس طرح اور آلات کے ذریعہ یہ اپنی جائے تعمیر تک پہنچائی گئیں،کس طرح اس وقت کے لوگوں نے ان تعمیروں کو ایک کو دوسرے کے اوپر رکھ کر تعمیر کیا، یہ میگالث لمبی مسافت سے لائے گئے پتھروں کے استعمال سے عام طور پر بنائے گئے اور آج یہ تعمیر اور ہندسے کے عجوبے سمجھے جاتے ہیں۔وہ لوگ جنھوں نے یہ بنائے ان کے پاس ضرور کسی قسم کی ترقی یافتہ ٹکنالوجی موجود رہی ہوگی،سب سے پہلے تو ان یادگاروں کی تعمیر کے لیے ایک ٹھوس منصوبہ بندی ضروری ہے،تا کہ ان منصوبوں کو اس میں مشغول ہر فرد تک صحیح اور مکمل طور پر پہنچایا جاسکے،ظاہر ہے جائے تعمیر کے لیے فنی نقشے بھی ضرور تیار کیے گئے ہوں گے،اس کے علاوہ ان نقشوں میں پیمائش بے خطا ہونی چاہیے کیوں کہ معمولی سی غلطی ان یادگاروں کی تعمیر کو ناممکن بنادے گی۔مزید برآں اس کے لیے تنظیم بھی بے عیب ہونی چاہیے اگر واقعتاً تعمیر واقع ہونا ہے۔کاریگروں کا آپس میں ارتباط اور ان کی ضروریات (کھانا،آرام وغیرہ) جیسے عناصر مطلوبہ انداز میں تعمیر کے تسلسل کے لیے ناگزیر ہیں۔جو لوگ ان یادگاروں کی تعمیر میں شریک تھے ان کے پاس عام تصور کیے جانے والے علوم سے کہیں زیادہ اعلیٰ علم اور بہتر ٹکنالوجی ہونی چاہیے۔جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے اوائل میں بیان کیا کہ تہذیب ہمیشہ ترقی کے ہم کنار نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی روبزوال بھی ہوجایا کرتی ہے اور یقیناً ترقی یافتہ اور پس ماندہ دونوں تہذیبیں بیک وقت دنیا کے مختلف حصوں میں موجود رہنے کے قابل ہیں۔

یہ انتہائی قرین قیاس ہے کہ جن لوگوں نے مطلوبہ میگالث کو تعمیر کیا ان کے پاس پیش رفتہ تہذیب موجود تھی،جیسا کہ قدیمی اور تاریخی آثار دکھاتے ہیں۔ان کے بنائی ہوئی تعمیرات دکھاتی ہیں کہ ان کے پاس ریاضیات اور ہندسہ کا وسیع وعریض علم موجود تھا، پہاڑی علاقوں کے غیر تغیر پذیر نکات کی پیمائش کر کے انھیں یادگاریں تعمیر کرنے کی مطلوبہ ٹکنالوجی پر عبور حاصل تھا،اور انھوں نے جغرافیائی مقامات کے تعین کے لیے کتب نما جیسے آلات استعمال کیے۔اور ضرورت پڑنے وہ دور دراز مقامات سے مطلوبہ مواد کے لیے نقل وحمل بھی

کر سکتے تھے، ظاہراً انھوں نے یہ جملہ انتظامات محض فرسودہ اوزار اور خدمت گزار افراد سے نہیں کیے ہوں گے۔

محققین اور آثار قدیمہ کے ماہرین کے بہت سے تجربات نے دوٹوک طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ ارتقا کے پیش کردہ احوال کے تحت ان یادگاروں کی تعمیر ایک غیر ممکن امر ہوتی۔ وہ محققین جنھوں نے اصحاب ارتقا کے تجویز کردہ حالات کے تحت خیالی ''پتھر کے زمانے'' کا نقشہ اپنے ذہن میں بٹھا کر ان یادگاروں کے مشابہ تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی اس مہم میں بری طرح ناکام ہوئے۔ ان محققین نے اس طرح کی مشابہ ساختیں تعمیر کرنا نہ صرف مشکل پایا بلکہ ان پتھروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں بے انتہا دشواری سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ یہ بات ایک دفعہ پھر دکھاتی ہے کہ اس وقت کے لوگوں نے پس ماندہ زندگیاں نہیں گزاری جیسا کہ ارباب ارتقا اس طرح کا عقیدہ رکھنے کیھم سے آرزومند ہیں۔ درحقیقت وہ لوگ نہ صرف فن تعمیر سے لطف اندوز ہوئے بلکہ مکمل سمجھ بوجھ بھی ان کے اندر تھی۔ انھوں نے تعمیری ٹکنالوجی کا ماہرانہ استعمال بھی کیا اور فلکیاتی تحقیقات کو بھی بروئے کار لایا۔

یہ بات مکمل طور پر قابل فہم ہے کہ محض پتھر کی سلیں، پتھر کی تعمیرات اور مختلف قسم کے پتھر کے اوزار ہزاروں سال پہلے کی تہذیبوں سے باقی رہنے چاہئیں۔ تاہم یہ بات منطقی نہیں ہے کہ چند پتھر کی تعمیروں اور فن پاروں کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کریں کہ اس وقت کے لوگوں کی تہذیب غیر ترقی یافتہ تھی، جو ٹکنالوجی سے یکسر عاری اور پتھر کے استعمال کے لائق تھے ۔مختلف عقائد پر مبنی ایسے دعوؤں کی کوئی سائنسی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم پہلے سے قائم شدہ نظریات کے منفی اثرات کے بغیر ان دریافتوں کا جائزہ لیں تو پھر حقیقت سے قریب تر اس کی تعبیر کی جاسکتی ہے کہ سیکڑوں ہزاروں سال پہلے ایک معاشرہ دل نشیں لکڑی والے گھروں میں رہتا تھا، لوگوں نے خوبصورت کوٹھیاں بنائیں جن میں شیشے دار کھڑکیاں اور دل کش ترین و پرآرائش مواد کا استعمال ہوا، تو ظاہر ہے کہ صدیوں کی آندھیوں، بارشوں، زلزلوں اور سیلابوں کے واقع ہونے والے زنگ آلود اثرات سے ان کے بچنے کا بہت تھوڑا

ثبوت باقی رہ سکتا ہے۔

قدرتی حالات کے تحت اوسطاً سو سے دو سو سال کے اندر عمارتی لکڑی، شیشہ، تانبا، کانسی اور مختلف دوسری دھاتیں کھسائی کا شکار ہوجاتی ہیں بالفاظ دیگر دو صدی کے دوران میں آپ کے گھر کی دیواریں گھسائی کی شکار ہوئی ہوں گی، اور اندرونی آرائشوں میں سے کچھ تھوڑا بہت بچا ہوگا۔ اور زلزلوں، سیلابوں یا طوفانوں کا شکار ہوجانے کی صورت میں اس سے بھی کچھ کم بچے گا۔ بقیہ شدہ چیزوں میں صرف پتھر کی سلیں جن کی فرسودگی کے لیے نسبتاً لمبی مدت درکار ہوتی ہے پھر بھی پتھر والے مواد گھس کر نسبتاً چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئے ہوں گے۔ اس لیے پتھر کی ان سلوں کی بنیاد پر اس وقت کے معاشروں کے روزمرہ معمول کے بارے میں تعبیرات کرنا ناممکن ہے۔ ان کے معاشی روابط، عقائد، ذوق اور فنی فہم وفراست کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مگر ارباب ارتقا اب تک اس محال کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں۔ وہ مختلف دریافتوں کی جھوٹی تعبیریں کرتے ہیں اور مختلف منظرناموں کو گڑھتے ہیں۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر خیالی قصے گڑھنا یہ وہ حقیقت ہے جس کی درحقیقت بعض ارتقاپسندوں نے خود بھی تنقید کی ہے، انھوں نے اس طرز تعبیر کو ''خواہ مخواہ کے قصوں'' کا نام دیا ہے۔

نظریہ ارتقا کے مشہور ماہر حجریات اسٹفن جے گولڈ (Stephen Jay Gould) کی تنقید میں یہ اصطلاح ملتی ہے جسے اس نے اسی نام کی کتاب مطبوعہ- ۱۹۰۲ء- مصنفہ: برطانوی شاعر و مصنف روڈیر کپلنگ (Rudyar Kipling) (۱۸۶۵ تا ۱۹۳۶) سے مستعار لی ہے۔

بچوں کے لیے لکھے گئے قصوں کی اس کتاب میں کپلنگ نے بہت سے خیالی قصے بیان کیے ہیں کہ جان داراشیا نے اپنے مختلف اعضا اور صفات کس طرح حاصل کیے ہوں گے، مثال کے طور پر ہاتھی کے سونڈ کے بارے میں اس نے لکھا ہے :

> پیارے بچو! بہت پہلے کی بات ہے کہ ایک بے سونڈ کا ہاتھی تھا جس کی ناک کالی اور بے ڈول تھی۔ ابھی وہ بچہ تھا اور دیکھنے میں عجوبہ روزگار معلوم ہوتا تھا۔

ایک بار وہ سیر کو نکلا تو خاکی سبز چکنائی والے لمپوپو دریا کے کنارے لکڑی کا کندا سمجھ کر ایک چیز پر چڑھ گیا جو کہ درحقیقت مگر مچھ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہاتھی کے بچے نے اپنا سر مگر مچھ کے خوشبودار اور چمکیلے منہ کے قریب کر دیا مگر مچھ نے ہاتھی کے بچے کی ناک کو پکڑ لیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہاتھی کا بچہ اپنے کلھے پر بیٹھ کر خود کو اس سے کھینچنے لگا اس نے خود کو زور سے کھینچا مگر مچھ پانی کے اندر گھس کر اپنے دم کی تیز حرکت سے پانی کو گدلا کر دیا اور اس کی ناک کو کھینچتا رہا۔نتیجہ میں اس کی ناک لمبی ہو کر سونڈ بن گئی۔

گولڈ اور اس طرح دوسرے ارتقا پسند سائنس دانوں نے اس ادب کو نشانہ تنقید بنا دیا جس میں مشابہ منظر ناموں کو بغیر کسی دلیل کے لاد دیا گیا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو نظریہ ارتقا کی اصطلاحوں میں معاشروں کی ترقی کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' کپلنگ کی کہانیاں'' کی مانند نظریہ ارتقا کے معاشی سائنس دانوں کی اس طرح کی کہانیوں کا انحصار بھی محض تخیل پر ہے۔یقیناً انسانیت کی تاریخ ان معاشروں پر مبنی ہے جن کے فرضی انسان صرف بھنبھناہٹ کے قابل تھے،خام پتھر والے اوزار استعمال کرتے تھے،غاروں میں رہتے تھے اور شکار اور اندوختگی کے ذریعہ اپنی بقا کا سامان کرتے تھے اور بعد میں انھوں نے ترقی کر کے کاشت کاری کرنی شروع کر دی، پھر دھاتوں کا استعمال ہونے لگا،اور ذہنی صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے معاشی روابط مستحکم کیے۔

یہ ''تاریخ'' اس قصے سے مختلف نہیں کہ ہاتھی کو سونڈ کیسے ملا۔ گولڈ اس غیر سائنسی طرز فکر کو اس طرح بیان کرتا ہے:

> سائنس دان جانتے ہیں کہ یہ قصے کہانیاں ہیں؛ جن کو بدقسمتی سے پیشہ ورانہ ادب میں پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں پر ان کو سنجیدہ اور کامل سمجھا جاتا ہے، پھر بعد میں یہ ''حقایق'' کا حصہ بن کر معروف ادب میں داخل ہو جاتے ہیں۔

مزید برآں گولڈ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ یہ قصے نظریہ ارتقا کی اصطلاحات میں کچھ بھی ثابت نہیں کرتے :

یہ ''خواہ مخواہ کے قصے'' ارتقاوالی قدرتی تاریخ کی روایت ہیں اور کسی حقیقت کو ثابت نہیں کرتے۔ مزید یہ کہ اس کے وزن اور اس قسم کے بہت سے حالات نے بہت پہلے میرے عقیدہ کو ڈاوانڈول کر دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سے تخلیقی ذہنوں نے اب تک اسے محفوظ کیا ہو لیکن وہ نظریے جن کی حمایت محض آسان قیاس آرائیاں کرتی ہیں میرے لیے زیادہ پرکشش نہیں ہوتے۔

نیوگرنگ
Newgrange

یہ اتفاقی امر ہے کہ ڈبلن کے قریب یہ یادگاری قبر تقریباً تین ہزار دو سو قبل مسیح بنائی گئی ہے۔ مصر، بے بی لون اور کریٹان کی تہذیبوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہی نیوگرنگ پرانا ہو چکا تھا۔ دنیا کے ایک مشہور ترین مجسمہ اسٹون ہنج (Stonhenge) ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نیوگرنگ نہ صرف ایک قبر تھا بلکہ اس کے معمار فلکیات کے جامع علم کے مالک تھے اور قابل ذکر مہندسانہ طریقہ ہائے کار اور تعمیراتی علم پر بھی پوری دسترس تھی۔

آثار قدیمہ کے بہت سے ماہرین نیوگرنگ کو فنی عجوبہ قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس تعمیر کا بالائی گنبد آپ ایک مہندسانہ عجوبہ ہے۔ نیچے سے بھاری اور اوپر سے ہلکے پتھر ایک دوسرے کے اوپر ایسے ماہرانہ انداز میں رکھے گئے ہیں کہ ہر ایک اپنے نچلے والے سے ذرا باہر کو نکلا محسوس ہوتا ہے، اس عمارت کے مرکزی حصہ سے ایک مسدس نما چھ میٹر اونچی چمنی اوپر کو اٹھتی ہے، چمنی کے اوپر پتھر کا ایک ڈھکن ہے جس کو اپنی مرضی سے کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس طرح کی بہت بڑی عمارت ان لوگوں نے بنائی جن کے پاس انجینئرنگ کی بہترین سمجھ بوجھ موجود تھی، صحیح طور سے پیمائش کرنے کے قابل تھے، صحیح منصوبہ بندی کر سکتے تھے، بھاری پتھروں کے نقل و حمل کا انتظام کر سکتے تھے، اور اپنی تعمیراتی سمجھ

بوجھ کا صحیح استعمال کر سکتے تھے۔ ارباب ارتقا اس بات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتے کہ یہ مجسمہ کس طرح کھڑا کیا گیا، کیوں کہ ان کے غیر حقیقی نظریے کے مطابق اس وقت کے لوگ فرسودہ اور پس ماندہ حالات میں زندگی گزارتے تھے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس طرح کی عظیم یادگار انجینئرنگ اور تعمیر کے بہترین علم کے بغیر کوئی منصۂ شہود پر لا سکے۔

اس مجسمہ کے محض فلکیاتی امتیازات بہت ہی حیران کن ہیں۔ یہ عظیم یادگار ایسے طریقے پر تعمیر کی گئی ہے کہ زمستانی نقطہ انقلاب پر اس کی دلکش روشنی اہل دید کے لیے سامان نظارہ ہوتی ہے۔ سال کے مختصر ترین دن (۲۱ر دسمبر) کا آغاز ہوتے ہی شعاع آفتاب (Newgrange) نیوگرنگ مقبرہ کو روشن کر دیتی ہے۔ اس موقع پر روشنی کا ایک بہت ہی انوکھا کرشمہ دیکھنے میں آتا ہے۔ چڑھتے سورج کی شعائیں گزرگاہ کے بالائی حصہ کی تہ میں موجودہ ایک چھوٹے سے سوراخ کے ذریعہ اندر داخل ہوتی ہیں، اور اپنی رہ گزر سمیت پورے کمرے کو جگا مگا دیتی ہیں۔ پتھر کی تمام سلیں ایسے زاویوں پر رکھی گئی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک تک روشنی کی رسائی ممکن ہو جاتی ہے اور چھن کر سب کو چمکا دیتی ہے۔ یہی وہ اہم خاصہ ہے جس کی وجہ سے روشنی کی یہ تمام نمائش ممکن ہو جاتی ہے۔

اس لیے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس عظیم مجسمہ کے معماروں کے پاس نہ صرف انجینئرنگ کا علم تھا بلکہ وہ علم فلکیات سے بھی پورے طور پر آگاہ تھے جس کے ذریعہ انھوں نے دنوں کی طوالت اور سورج کی حرکات کی پیمائش کی۔ یہ نیوگرنگ برطانیہ میں اب تک باقی رہنے والے پتھر کے متعدد قدیم مجسّموں میں سے صرف ایک ہے۔ اس مجسمہ کو دیکھنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ بنایا ان کے پاس علم کا کیسا خزانہ موجود رہا ہوگا، بلاشبہہ انھوں نے پیش رفتہ طریقہ ہائے کار اور صنعت گری کا بھرپور استعمال کیا ہوگا۔ ایسے لوگوں کی طرزِ زندگی کی تعبیر کن الفاظ میں ممکن ہو سکتی ہے جن لوگوں نے ایسے مجسّمے بنائے، انھوں نے ممکن ہے کہ آرام دہ اور مہذب ماحول میں زندگی گزاری ہو۔ اگر ان کے پاس علم فلکیات اور مشاہدات کی صحیح تعبیر کرنے کی مہارت تامہ موجود تھی تو اس لحاظ سے ان کے روزمرہ کا معمول بھی مہذب رہا ہوگا۔ پتھر کی یہ یادگار ممکن ہے کہ اس معاشرے کی

باقی رہ جانی والی عمارتوں میں سے ایک ہو جو آرام دہ گھروں میں زندگی گزارتے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ رکھوالی کیے ہوئے بہترین باغات ،اچھے ہسپتالوں میں علاج ومعالجہ، تجارتی سرگرمیوں میں مشغولیت ،فن وادب کی بھرپور سرپرستی اور ایک وسیع ،اہم اور ثقافتی وراثت سے بہرہ مند ہوئے تھے۔ تاریخی حقائق اور آثار قدیمہ کی دریافتوں کی بنیاد پر یہ پتھر کی یادگار بنانے والے لوگوں کی حقیقت پسندانہ تعبیرات ہیں۔مگر ارتقا پسندوں کی عادت ہے کہ وہ صرف مادہ پرستانہ خطوط پر سوچتے ہیں اور ان قصوں کو ترجیح دیتے ہیں جو سائنس سے موافقت رکھنے والی منطقی تعبیرات کی بجائے کسی خاص عقیدے کی پیداوار ہوں۔تاہم یہ کہانیاں ایک خصوصی اور سچی تشریح کے کسی باب کو وانہیں کرسکتیں۔

اسٹون ہنج

Stonehenge

اسٹون ہنج انگلستان میں قائم ایک یادگار ہے جو ایک دائرے میں ترتیب سے رکھے ہوئے پتھر کی تقریباً تیس بڑی سلوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر ایک پتھر اوسطاً چار اعشاریہ پانچ میٹر (۱۵رفٹ) اونچا اور اوسط وزن پچیس ٹن ہے۔ یہ یادگار بہت سے محققین کی مرکز توجہ رہ چکی ہے۔اور اس سلسلہ میں بہت سے نظریے پیش کیے گئے ہیں کہ یہ کیسے اور کیوں کھڑی کی گئی؟۔اس مقام پر ہمارا مقصود یہ بتانا نہیں ہے کہ ان میں سے کون سا نظریہ واقعتاً درست ہے بلکہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ یہ یادگار ایک بار پھر انسانی تاریخ کے ''ارتقا '' والے نظریے کو باطل قرار دیتی ہے۔

تحقیق بتاتی ہے کہ اسٹون ہنج کی تعمیر تین بنیادی مراحل سے گزری ہے اور اس کا آغاز ۲۰۰۸ قبل مسیح میں ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر اس تعمیر کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے۔تعمیر کا ابتدائی مرحلہ نشانے لگا کر بعض مدور بلیں، کنارے اور خندق کی کھودائی پر مشتمل تھا۔ دوسرے مرحلہ میں تقریباً اَسّی نیلے پتھر اس مقام کے مرکز کے گرد دو دائروں میں ترتیت وار رکھے گئے، عقبی پتھر اس سے باہر کھڑے کیے گئے، بعد میں بڑے پتھروں کے لمبے پتلے

اُفقی ٹکڑوں کے ایک متواتر سلسلے کے ساتھ پتھروں کا ایک بیرونی دائرہ بنایا گیا،اس یادگار کے اہم ترین پہلو اس میں استعمال ہونے والے نیلے پتھر ہیں کیوں کہ اس قسم کے پتھر قرب وجوار میں پایاب نہیں ہیں، یہ تقریباً تین سواَسّی کلومیٹر(۲۴۰ میل) دور واقع پریسیلی (Preseli) پہاڑیوں سے اس مقام تک منتقل کیے گئے تھے۔جیسا کہ ارتقا والے تاریخ داں دعویٰ کرتے ہیں کہ اس دور کے لوگ فرسودہ حالات میں زندگی گزارتے تھے اور اس وقت ان کے پاس لکڑی والے اوزار، لٹھوں کے ٹھاٹھ،اور پتھر کی کلہاڑیاں جیسے اوزار ان کے استعمال میں تھے۔تو پھر ان کے لیے ان بڑے پتھروں کو اس علاقے میں منتقل کرنا کیسے ممکن ہوسکا جہاں پر آج اسٹون ہنج قائم ہے۔اس سوال کا جواب ان منظرناموں سے نہیں ملتا جو محض قیاس آرائیوں کے فریب سے آلودہ ہیں۔

محققین کی ایک جماعت نے عہدِقدیم پر قیاس کرتے ہوئے اسٹون ہنج سے اتنی مسافت کے اندازے پر نیلے پتھروں کو منتقل کرنے کے لیے اس طرح کے آلاتِ حمل ونقل بنائے،اس مقام پر انھوں نے لکڑی کا ایک آلہ متحرکہ،اسی سائز کے پتھروں کی حمل ونقل کے قابل تین لٹھوں کے ٹھاٹھ بیک وقت حرکت دے کر لکڑیوں کے اس ٹھاٹھ کو لکڑی کے چپو کی مدد سے سمت مخالف میں چلایا بالآخر سادہ پہیوں کی مدد سے پتھروں کو پہاڑ کے اوپر چڑھانے کی کوشش کی گئی،لیکن ان کی یہ سعی لاحاصل رہی۔ یہ صرف ایک تجربہ ہے تاکہ یہ ثابت کرسکیں کہ نیلے پتھروں کو اسٹون ہنج سے دور واقع اس مقام سے کس طرح منتقل کیا گیا تھا۔اس طرح کے بہت سے اور تجربے کیے گئے ہیں اور محققین نے ان طریقوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت کے لوگوں نے نقل وحمل کے لیے کون کون سے طریقہ استعمال کیے ہوں گے۔مگر ان میں سے کوئی بھی کوشش بارآور ثابت نہیں ہوئی کیوں کہ وہ سب تجربے اس غلط خیال کی پیداوار ہیں کہ اسٹون ہنج تعمیر کرنے والے لوگ ثقافتی طور پر پس ماندہ تھے، اور پتھروں اور لکڑیوں کے بنائے ہوئے خام اوزار استعمال کرتے تھے۔

ایک دوسرا وضاحت طلب نکتہ یہ ہے کہ یہ مذکورہ تجربے موجودہ دور کی ٹکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے کیے گئے ہیں۔انھوں نے بحری جہاز ساز مراکز میں بنائے گئے مختلف نمونوں کو استعمال کیا ساتھ ہی اعلیٰ ٹکنالوجی کے حامل کارخانوں میں تیار کردہ رسیاں بھی

استعمال کیں۔ نیز تفصیلی منصوبہ بندیاں اور پیمائشیں بھی کی گئیں،اس کے باوجود کوئی مثبت نتیجہ ان کے ہاتھ نہ لگا۔تاہم پانچ ہزارسال قبل رہنے والے لوگوں نے کئی ٹنوں والے پتھروں کو منتقل بھی کر دیا اور صحیح جغرافیائی مقامات کی پیمائش کر کے دائرہ میں ان کو ترتیب وار سجا بھی دیا۔یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے یہ کام محض پتھر والے اوزاروں ،لٹھوں کے ٹھاٹھوں اور لکڑی کے آلاتِ متحرکہ سے نہیں کیے۔اسٹون ہنج اور دوسرے بہت سے ضخیم پتھروں سے بنائی گئیں یادگاریں کچھ ایسی ٹکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے بنائی گئیں جو آج ہمارے حاشیہ گمان میں بھی نہیں آسکتیں۔

تیاہوانا کو کے شہر میں حیران کن آثار

The Astonishing Remains in the City of Tiahuanaco

سطح سمندر سے تقریباً چار ہزار میٹر(۱۳۰۰۰ ہزار فٹ)او پر پیروں اور بلیویا کے درمیان آندس (Andes) پہاڑوں میں موجود تیاہوانا کو کا شہر زائرین کو محوِ حیرت کر دینے والے کھنڈرات سے بھرا پڑا ہے۔ یہ علاقہ نہ صرف جنوبی امریکہ بلکہ پوری دنیا کے آثار قدیمہ کا ایک عجوبہ تصور کیا جاتا ہے۔

تیاہوانا کو میں سب سے حیران کن چیز وہ جنتری ہے جو اعتدالِ شب و روز،مواسم اور ہر گھنٹہ پر چاند کے منازل اور اس کی حرکتوں کو دکھاتی ہے۔یہ جنتری ان شہادتوں میں سے ایک ہے کہ اس وقت کے لوگ اعلیٰ ترقی یافتہ ٹکنالوجی کے حامل تھے۔تیاہوانا کو کے دوسرے عجیب آثار میں وہ یادگاریں شامل ہیں جو سوٹن کے برابر بڑے بڑے پتھروں کی سلوں سے بنائی گئی ہیں۔

ریڈرز ڈائجسٹ(Reader's Digest)کے مصنف نے لکھا ہے :

> آج کے بہترین انجینئر اب تک خود سے یہ سوال پوچھتے رہتے ہیں کہ آیا وہ اس شہر کی تعمیر میں استعمال ہوئی چٹانوں کی ان بڑی بڑی چٹانوں کو حرکت دے سکتے ہیں اور ان کو کاٹ سکتے ہیں۔یہ بڑے پتھر ایسے محسوس ہیں جیسے کہ ان کو کاٹنے

کے لیے کوئی سانچہ استعمال کیا گیا ہو۔۴۱

مثال کے طور پر شہر کی دیوار اس طرح بنائی گئی ہے کہ سو ٹن والے بھر بھرے پتھروں کی سلوں کے اوپر ساٹھ ٹن والے پتھر کی سلیں رکھی گئیں ہیں۔ان دیواروں کی تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھر کے اس کام کے لیے انتہائی مہارت درکار تھی۔بڑی چوکور سلیں درست جھریوں کے ساتھ ملائی گئی ہیں۔دس ٹن وزنی سلوں میں دو اعشاریہ پانچ میٹر (۸ فٹ) لمبی سوراخیں کی گئی ہیں۔کھنڈرات کے بعض حصوں میں ایک اعشاریہ آٹھ میٹر (۶ فٹ) لمبی اور نصف میٹر (۱۔۵ فٹ) چوڑی پتھر میں پانی کی گزرگاہیں بنائی گئی ہیں۔ان میں ایسی باقاعدگی پائی جاتی ہے جس کی شاذونادر ہی کوئی مثال مل سکتی ہے۔اور یہ ناممکن ہے کہ فنی وسائل کی عدم موجودگی میں انھوں نے اس قسم کے فن پارے ایجاد کیے ہوں جیسا کہ ارباب ارتقا دعوی کرتے ہیں۔ایسا اس لیے ہے کہ مبینہ فرسودہ حالات کے تحت ان جیسی تعمیرات کے لیے انسانی زندگی سے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔اس کا مطلب ایک مرتبہ پھر یہ ہوگا کہ تیاہوناکو کی تعمیر کے لیے صدیاں لگی ہوں گی جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ ارباب ارتقا کا نظریہ جھوٹا ہے۔

تیاونا کو کی سب سے زیادہ قابل ذکر یادگاروں میں سے ایک معروف ترین باب الشّمس (Gate of the Sun) ہے۔تین میٹر (۱۰رفٹ) اونچی، پانچ میٹر (۱۶ر اعشاریہ پانچ فٹ) چوڑی، اور تقریباً دس ٹن کے وزن سے زیادہ پتھر کی ایک سل سے بنایا گیا ہے۔اس دروازہ پر مختلف قسم کی نقش نگاریاں کی گئی ہیں۔اس کو بنانے کے لیے کون سے طریقے استعمال کیے تھے یہ ابھی تک وضاحت طلب ہے۔اس دلکش عمارت کی تعمیر میں کس قسم کی ٹکنالوجی استعمال کی گئی، دس ٹن سے زیادہ وزن والا پتھر کس طرح کان سے نکالا گیا اور پھر کن وسائل کے ذریعہ جائے تعمیر اس کی منتقلی ممکن ہوئی۔یہ بات واضح ہے کہ یہ تمام کامیابیاں انھوں نے محض ان سادے اوزار و وسائل کو استعمال کر کے نہیں حاصل کیں جن کا ارباب ارتقا دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر آپ تیاہوناکو کے جائے وقوع کے جغرافیائی حالات پر بھی غور کریں تو یہ پورا

کارنامہ کچھ مزید حیران کن گوشوں کا انکشاف کرے گا۔ یہ شہر آبادی والے علاقوں سے میلوں دور ہے اور چار ہزار میٹر (۱۳۰۰۰ ہزار فٹ) اونچائی والی سطح مرتفع پر واقع ہے جہاں پر ہوائی دباؤ سطح سمندر کے تناسب سے محض نصف ہے۔ یہاں پر آکسیجن کی مقدار میں انتہائی کمی اس کام کے لیے درکار انسانی مشقت کو مزید مشکل تر بنا دیتی ہے۔

یہ سب باتیں دکھاتی ہیں کہ دنیا کے بہت سے دوسرے علاقوں میں ماضی کے اندر پیش رفتہ تہذیبیں آباد تھیں جو اس نظریے کو باطل قرار دیتی ہیں کہ معاشرے ہمیشہ زیادہ ترقی یافتہ حالت کی طرف ''ارتقا'' کرتے چلے آئے ہیں۔

قدیم مصر: فنی اور سائنسی نقطہ نظر سے ایک عظیم الشان تہذیب

Ancient Egypt: A Magnificent Civilization in Terms of Art and Science

قدیم اہل مصر کی تہذیب انسان کے ہاتھوں ایجاد شدہ سائنس اور فن کے لحاظ سے دنیا کی عظیم تہذیبوں میں سے ایک ہے۔قدیم اہل مصر امکان سے زیادہ علم اور تجربہ کے حامل ہوتے اگر وہ کسی فرسودہ معاشرے کے سلسلہ کی ایک کڑی یا ''وارث'' رہ چکے ہوتے ۔مصریوں میں ایک طرف تو باطل پرستانہ اور کفری دین کے علم بردار موجود تھے تو دوسری طرف وہ یہودی کاریگر بھی تھے جن کے فن کا سرچشمہ حضرات نوح وابراہیم-علیہما السلام-کے ادوار میں پھوٹا تھا۔ سابقہ پیغمبروں کے عہد میں موجودہ علم سے یہ ماہرین مستفید ہوتے تھے۔مصریوں کی کامیابیاں آج تک دنیا کے بیشتر علاقوں میں ضرب المثال بنی ہوئی ہیں۔ایشیا کے مختلف خطوں جنوبی امریکہ، یا افریقہ بشمول مصر میں گزشتہ تہذیبوں کے درجے سے کم تر درجہ کی زندگی ابھی بھی گزاری جا رہی ہے۔قدیم مصر کی تہذیب جس نے طب، علم تشریح ،شہری منصوبہ بندی، فن تعمیر، فنونِ لطیفہ اور پرچہ بافی کے میدانوں میں بطورِ خاص اپنی کامیابیوں کا ایسا لوہا منوایا کہ سائنس داں آج بھی بڑی حیرت اور مرعوبیت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

قدیم مصری طب کے سر چشمے
The Origins of Ancient Egyptian Medicine

قدیم مصر کے جراحوں کے حاصل کردہ کارنامے نہایت حیران کن ہیں۔کھدائیوں سے ہاتھ آنے والی دریافتوں نے ماہرین آثار قدیمہ کو ششدر کر کے رکھ دیا ہے؛ کیوں کہ کسی بھی تاریخ داں کو توقع نہیں تھی کہ تین ہزار قبل مسیح میں موجود ایک تہذیب ایسے اعلیٰ ترقی یافتہ ٹکنالوجی کی مالک ہوگی ۔ ممیوں کا شعاعی تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ قدیم مصر میں دماغ کا آپریشن کیا جاتا تھا،مزید برآں یہ عملیات اعلیٰ پیشہ ورانہ آلات کو استعمال کر کے کیے جاتے تھے ۔ مرحلۂ آپریشن سے گزری ہوئی ایسی ممیوں کی کھوپڑیوں کا جب اس دور میں مطالعہ کیا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ جراحت کی یہ قطع و برید کتنے ماہرانہ طریقے پر عمل میں لائی گئی ہے۔کھوپڑی کی آپس میں دوبارہ مل جانے والی ہڈیاں دکھاتی ہیں کہ اس طرح کے آپریشنوں کے بعد بھی مریض عرصہ دراز تک بقید حیات رہا ہے۔

ایک دوسری مثال مختلف دوائیوں سے متعلق ہے۔انٹی بیاٹک کی دریافت کے بشمول تجرباتی سائنس میں کی گئی تیز ترقی کی وجہ سے انیسویں صدی میں دوائیوں کے میدان میں بڑی اہم پیش رفتیں کی گئی ہیں۔مگر لفظ ''دریافت'' کا یہ یہاں پر استعمال صحیح نہیں کیوں کہ اس قسم کے بہت سے طریقہ کار قدیم مصریوں کے ہاں پہلے ہی معلوم اوران کے معمول میں داخل تھے۔

سائنس اور علم میں اہل مصر کس حد تک پیش رفتہ تھے۔اس کا ثبوت ان کی چھوڑی ہوئی ممیاں بعض اہم ثبوتوں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے ممی بنانے کے لیے سیکڑوں مختلف طریقے استعمال کیے جس کے ذریعہ ہزار ہا سالوں تک ذی روح اشیا کے ابدان کو محفوظ رکھے گئے۔

ممی بنانے کا طریقہ کار انتہائی پیچیدہ ہے۔سب سے پہلے دماغ اور مردے کے بدن کے اندرونی اعضا خصوصی آلات کے استعمال سے نکالے جاتے ہیں ،اس طریقہ کار کا

اگلا مرحلہ چالیس دن تک نیٹرون (Natron) سے بدن کو خشک کرنے پر مشتمل ہے ۔(نیٹرون ایک معدنیاتی نمک ہے جو بنیادی طور پر سوڈیم سلفیٹ اور سوڈیم کلورائڈ کی چھوٹی سی مقدار کے ساتھ سوڈیم کاربونیٹ اور سوڈیم بائی کاربونیٹ کا آمیزہ ہے) بدن کے کافی حد تک رطوبات کو کم کرنے کے بعد بدن کے جوف کو سوتی کپڑا، ریت یا بورادہ ٹھونس کر بھر دیا جاتا ہے، چمڑے پر جڑی بوٹیوں سے تیارہ کردہ خاص مواد لگائے جاتے ہیں، پھر مزید تحفظ کے لیے مائع گندہ بروزہ کی تہ چڑھائی جاتی ہے، بالآخر بدن کو احتیاط کے ساتھ سوتی پٹیوں سے باندھ دیا جاتا ہے۔

مومی بنانے کا یہ عمل بدن کی شکل کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر مردے کے تمام اندرونی اعضا کو نکالتے ہوئے کیا جاتا ہے۔تو یہ دکھاتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ اعمال سرانجام دیے وہ علم تشریح سے خوب خوب آشنا تھے تاکہ مختلف اعضا کے جائے وقوع کو جان لیں۔مومی بنانے کے طریقوں کے علاوہ اہل مصر پانچ ہزار سال پہلے اور بھی بہت سے مختلف طبی رموز سے آشنا تھے :

مصر کے اندر طب میں مشغول اہل دانش اپنی عبادت گاہوں میں بے شمار بیماریوں کا علاج کیا کرتے تھے۔آج کی طرح مصری ڈاکٹر طب کے مختلف میدانوں میں متخصص تھے ۔ہر ڈاکٹر کو اس کے تخصص کے میدان میں خدمات انجام دیے جانے کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔

-ریاستی سطح پر مصر کے ڈاکٹروں کی سرپرستی کی جاتی تھی۔اگر کبھی مریض صحت یاب نہ ہوتا یا مرجاتا تو ریاست ان وجوہات کی تحقیق کراتی اور یہ بات متعین کرتی کہ ڈاکٹر کے استعمال کیے ہوے طریقہ علاج میں اصول وقواعد کی پابندی کی گئی ہے یا نہیں۔اگرعلاج کے دوران کسی فروگزاشت کا سراغ لگ جاتا تو ڈاکٹر قانون کے دائرے میں موردسزا ٹھہرایا جاتا تھا۔

-ہر عبادت گاہ میں طبی آلات سے لیس تجربہ گاہ ہوتی، جہاں پر دوائیں تیار اور محفوظ کی جاتی تھیں۔

دواسازی کے پہلے اقدامات اور زخم کی پٹیوں کے استعمال کی تاریخ قدیم مصری ادوار تک پہنچ جاتی ہے۔سمث پپیرس (Smith Papyrus)(جو مکمل طور پر دوائی سے متعلق ہے) کے اندر موجود ہے کہ پٹی بنانے کے لیے سوتی کپڑے کی چمٹنے والی پٹیاں زخم کو ڈھاپنے کے لیے کس طرح استعمال ہوتی تھیں۔

-آثار قدیمہ کی دریافتوں نے مصر میں طبی طریقہ کار کا ایک تفصیلی نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔مزید برآں اپنے اپنے میدانوں میں سو سے زیادہ متخصص ڈاکٹروں کے نام اور خطابات سامنے آ گئے ہیں۔

-کوم اومبو (Kom Ombo) کے مقام پر عبادت خانے کی دیوار پر ابھرے ہوئے نقوش میں آلات جراحت پر مشتمل ایک صندوق کی کندہ کاری کی گئی تھی۔اس صندوق میں دھات کی بنی ہوئی قینچیاں، جراحی کی چھریاں، آرے ،زخم سلائیاں، زبان کو دبانے کے چمچے، آنکڑے اور جراحی کی چمٹیاں تھیں۔

-مختلف اور بہتیرے طریقہ ہائے جراحی استعمال ہوتے تھے۔معمولی کھاؤ کے ساتھ ہڈیاں ٹوٹ جانے کی بھی اصلاح کی جاتی تھی نیز اس کے لیے لکڑیوں کی کھپچیاں استعمال ہوتی تھیں، اندمالِ زخم کے لیے ٹانکے لگائے جاتے تھے، ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا علاج بڑی کامیابی کے ساتھ کیا جاتا تھا جن کا انکشاف بہت سی ممیوں میں بھی ہوا ہے۔

-اگرچہ ممیوں میں داغ ہائے جراحی کے آثار نہیں ملتے لیکن سمث پپیرس میں زخم کے ٹانکوں کے تیرہ حوالہ جات موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ مصریوں نے زخموں کو ٹانکنے کے سلسلہ میں سوتی دھاگے کا بہترین انتظام کیا تھا۔زیادہ تر سوئیاں تانبے کی بنی ہوئی تھیں۔

-مصر کے ڈاکٹر جراثیم اور بلا جراثیم والے زخموں کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ جراثیم زدہ زخموں کی صفائی کے لیے پسے ہوئے مٹر، صنوبر کا تیل اور پہاڑی بکری کی چربی کا آمیزہ استعمال کیا کرتے تھے۔

۔ پینے سلین اور انٹی بیاٹکس نسبتاً حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔ تاہم قدیم مصری دوسرے مختلف قسم کے انٹی بیاٹکس کی ابتدائی نامیاتی اقسام استعمال کیا کرتے تھے نیز انھوں نےمختلف قسم کی بیماریوں کے لیے موزوں نسخے بھی لکھے ہیں۔

فن طبابت میں ان عظیم اقدامات کے علاوہ کھدائیوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ شہری منصوبہ بندی اور فن تعمیر جیسے موضوعات بھی مصریوں کی دلچسپیوں کا خاص میدان رہے ہیں۔

قدیم مصر کی پیش رفتہ دھات کاری

Advanced Metallurgy in Ancient Egypt

عام مفہوم میں دھات کاری سائنس اور ٹکنالوجی کا وہ شعبہ ہے جس کا تعلق خام مواد کی صفائی، دھاتوں کے تحفظ اور ان کے مرکبات بنانے سے رہا ہے۔ قدیم مصری تہذیب کا مطالعہ دکھاتا ہے کہ تین ہزار اور تین ہزار پانچ سو سال قبل کی درمیانی مدت میں اہل مصر متعدد معدنیات اور دھاتوں بالخصوص سونا، تانبا اور لوہے کے کاریگری اور معدنوں سے اس کو نکالنے میں ماہر بن چکے تھے۔ ان کی انتہائی پیش رفتہ دھات کاری دکھاتی ہے کہ مصری خام دھاتوں کے استعمال، ان کے اخراج اور ان کی دریافت کرنے میں کافی ترقی یافتہ تھے ۔اور علم کیمیا کے اسرار و رموز پر دسترس رکھتے تھے۔

آثار قدیمہ کی تحقیق نے دکھایا ہے کہ تین ہزار چار سو قبل مسیح کے قریب اہل مصر دھاتوں کے مرکبات بنانے نیز تانبے کی کچی دھاتوں کی جملہ تفصیلات پر آگاہ تھے ۔ چوتھے خاندان سلاطین (تقریباً دو ہزار نو سو قبل مسیح) میں کان کنی پر تحقیق اور کارگزاریاں اعلیٰ درجہ کے سرکاری افسران کی نگرانی میں ہوا کرتی تھیں نیز مشہور ہے کہ ابنائے فرعون اس کی سرپرستی سرانجام دیتے تھے۔

تانبے کے علاوہ قدیم اہل مصر اکثر لوہے کا استعمال کیا کرتے تھے۔ کانسی کے لیے قلعی

اور رنگین شیشہ بنانے میں کوبالٹ استعمال کی جاتی تھی ، جو دھات مصر میں قدرتی طور پر دستیاب نہ تھے ان کو دوسرے علاقوں بالخصوص فارس سے درآمد کیا جاتا تھا۔

سونا کثیر الاستعمال قیمتی دھات تھا۔سینکڑوں سونے کی کانیں مصر اور آج کے سوڈان کے مختلف حصوں علاقوں میں دریافت کی گئی ہیں۔ اپولی نوپولیس (Apollinopolis) کے قریب چودہ صدی قبل والا ایک ورقی دستاویز سونے کی ایک کان کے نقشوں پر مشتمل ہے جو اس موضوع پر قدیم مصریوں کی پیشہ ورانہ مہارت کی عکاسی کرتی ہے ۔اس قدیم ورق کا نقشہ اس کان کے گرد تیرہ سو سے زیادہ گھروں کی تعمیر آشکار کرتا ہے جو اس میں کان کنوں کی رہایش کے لیے مخصوص تھے۔اس سے قدیم مصر میں سناری اور زیورات کے فن کی ترقی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔آثار قدیمہ کی کھدائیوں میں دریافت ہونے والے سیکڑوں منقش زریں برتن اس بات کے یقینی قرینے ہیں کہ قدیم اہل مصر کان کنی اور دھات کاری میں میدانوں میں اپنا سا جمائے ہوئے تھے۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اہل مصر اس سائنسی علوم اور ضروری ٹکنالوجی سے بھی آراستہ تھے جس سے وہ دھاتوں کے طبقات کی شناخت، کچے دھاتوں کا اخراج، اخراج شدہ دھاتوں کی صفائی، اور بھرت بنانے کے لیے دوسری دھاتوں کے ساتھ اس کی آمیزش کیا کرتے تھے۔

قدیم اہل مصر کی بلدیاتی منصوبہ بندی اور بنیادی سہولیات کی فراہمی
Ancient Egyptian Urban Planning and Infrastructure

مصر کی خشک آب وہوا کی وجہ سے اس کی تہذیبوں کے انمٹ نشانات تاہنوز باقی ہیں ۔جو اس بات کی دلیل ہے کہ قدیم اہل مصر نے اپنے شہروں کی تعمیر وترقی کے لیے منظم منصوبہ بندی کی تھی جو یہ دکھاتی ہے کہ جن لوگوں نے یہ شہر بنائے ان کے پاس فن تعمیر اور انجینئرنگ کا تفصیلی علم موجود تھا کہ کس حد تک زیر زمین بنیادیں کھودنے کی ضرورت ہے، کہاں پر پشتی بانی والے شہ تیر کو رکھنے کی ضرورت ہے، موثر ہوادار نظام کا بندوبست کیسے کیا جائے ، صاف

اور گدلے پانی کے آپس میں نہ ملنے کے لیے الگ نالیوں کا انتظام، اور اس طرح کی بہت سی دوسری تدابیر یقیناً زیرِ غور رہی ہوں گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان پروجیکٹس میں کسی غلطی کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے۔ اہل مصر ان سب طریقوں سے باخبر تھے، اور اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی ان کی یہ تعمیرات اس بات کا بین ثبوت ہیں۔

تین ہزار سال قبل استعمال کیے گئے یہ تعمیراتی طریقہ ہائے کار انتہائی پیشہ ورانہ تھے ، اور فن تعمیر سے متعلق مسائل و مشکلات کو حل کرنے کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ مصر جیسے خشک ملک کے لیے پانی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ درحقیقت انھوں نے پانی محفوظ کرنے کے لیے ذخیرہ آب کر کے اس مسئلہ کا مستقل حل تلاش کر لیا۔

ان میں سے پانی کا ایک بڑا ذخیرہ وہ ہے جو فیوم (Fayum) نخلستانی وادی میں پایا گیا۔ اہل مصر نے بعض مصنوعی جھیلیں بھی بنائیں تا کہ اس بات کی یقین دہانی ہو سکے کہ مخصوص علاقوں میں زندگی برقرار رہ سکتی ہے۔ یہ چھوٹی جھیلیں دریائے نیل سے پانی اکٹھے کرتی تھیں اور اس طرح صحرائے مصر میں ایک ترقی یافتہ تہذیب سر اٹھا سکی۔ انھوں نے آج کے قاہرہ کے جنوب مغرب میں اسی کلومیٹر (۵۰ میل) کے فاصلے پر موئرس (Moeris) نامی جھیل بنایا تا کہ ایک نہر کے ذریعہ دریائے نیل سے پانی کی ذخیرہ اندوزی کی جا سکے۔ اسی ذخیرۂ آب کے قریب آبادیاں اور عبادت گاہیں تعمیر کی گئیں۔

اہل مصر کا علم طبابت، شہری منصوبہ بندی، انجینئرنگ اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے طریقہ کار اس غیر معمولی پیش رفتہ تہذیب کے بعض دلائل ہیں۔ ان کا علم، اور ان کے نافذ کردہ اقدامات ایک دفعہ پھر اس نظریے کی تردید کرتے ہیں کہ معاشروں نے فرسودہ حالت سے ایک تہذیب یافتہ حالت کی طرف ترقی کی ہے۔ وہ معاشرہ جو پانچ ہزار سال قبل موجود تھا وہ آج اسی ملک میں رہنے والے بعض معاشروں سے کہیں زیادہ تہذیب کے اعلیٰ تر درجے پر فائز تھے۔ یہ ایسی تفصیلات ہیں جو ''ارتقائی ترقی'' کی اصطلاح میں ناقابل تشریح ہیں۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جس دور میں اہل مصر ایسی پیش رفتہ تہذیب سے لطف

اندوز ہو رہے تھے تو اسی دور میں افریقہ اور دنیا کے دوسرے خطوں میں انتہائی زیادہ فرسودہ حالات میں زندگی گزارنے والے نسبتاً پس ماندہ معاشرے بھی موجود تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی فرد کسی ایسی صفت کا حامل نہ تھا جس کی وجہ سے اسے درجۂ انسانیت سے گرا اور فرضی بندر جیسی صفات سے متصف مانا جائے۔ جب دوسرے لوگ اہل مصر کے ساتھ ہم عصر ہو کر فرسودہ حالات میں زندگی گزار رہے تھے تو ان کی طرح اور سیکڑوں ہزاروں سال قبل کے انسانی معاشروں کی طرح وہ تمام پہلوؤں سے آج ہی کے انسان کی مانند مکمل انسان تھے۔ بعض معاشروں نے نسبتاً ترقی یافتہ حالات میں زندگیاں گزاری ہوں گی اور بعض دوسروں نے نسبتاً پس ماندہ، لیکن نظریہ ڈارون کے دعوؤں کے مطابق یہ اس بات کو نہیں دکھاتا کہ ان کا سررشتہ بندروں سے ہو کر آیا ہے، یا ان کی ایک نسل دوسرے سے ارتقا کر کے آئی ہے، اس قسم کی تعبیر خالی از دلیل، غیر منطقی اور غیر سائنسی ہے۔

قدیم اہل مصر کے پارچہ بافی میں کارہائے نمایاں

An Advanced Level of Mathematics

دو ہزار پانچ سو قبل مسیح سے بچ رہنے والے سوتی کپڑے کے ٹکڑوں سے یہ آشکار ہوتا ہے کہ اہل مصر بُنائی اور میٹریل کے لحاظ سے بہت ہی اعلیٰ قسم کے کپڑے تیار کرتے تھے۔ ان میں سب اہم تاہم کپڑے کی بنائی کی تفصیلات ہیں۔ قدیم اہل مصر نے دو ہزار پانچ سو قبل مسیح مومیوں کے اردگرد لپیٹنے کے لیے کتان کے ایسے باریک ریشے بنائے جو آج اعلیٰ ٹکنالوجی سے لیس مشنری کے ذریعہ بنائے جاتے ہیں۔ ان کپڑوں کی باریک بنائی نے ماہرین آثارِ مصر کو حیران و ششدر کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ نمونے اتنے باریک ہیں کہ جن کو ریشم سے امتیاز کے لیے محدب عدسہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ کپڑا آج کے مشینی کھڈیوں کے بہترین کام کے مشابہ ہے۔ یہاں تک کہ آج یہ کپڑے اپنے کوالٹی کی وجہ سے مشہور عالم ہیں اور آج کا بنایا گیا مصری کتان اپنے ان جلاہوں کی شہرت کا مرہون منت ہیں جو دو ہزار قبل مسیح میں رہتے تھے۔

ریاضیات میں کمال
An Advanced Level of Mathematics

قدیم مصر میں بالکل ابتدائی دور سے اعداد استعمال ہوتے تھے۔ دو ہزار قبل مسیح کی ریاضی مسائل سے متعلق شہادتیں دکھاتی ہیں کہ ان میں جن چار دستاویزات کے سب سے زیادہ حوالے دیے جاتے ہیں وہ پارہاے کاہون ، برلن ، ماسکو، اور رینڈ ورقی دستاویزوں کے نام سے مشہور ہیں جو پیمائشی قواعد وضوابط کو مثالوں کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔ اہل مصر جانتے تھے کہ ایک مثلث جس کے اطراف کی پیمائش ۳:۴:۵ ہوتو یہ قائمۃ الزاویہ مثلث ہوتا ہے۔ اور آج نظریہ فیثاغورس کے نام سے مشہور علم کا انھوں نے اپنی تعمیراتی اعداد وشمار میں استعمال کیا ہے۔

مزید برآں اہل مصر ستارے اور سیارے کے درمیان فرق پر بھی مطلع تھے ، انھوں نے علم فلکیات کے اپنے مطالعہ میں ان ستاروں کا بھی اضافہ کیا جو کھلی آنکھ سے بمشکل نظر آتے ہیں۔ اور چوں کہ اہل مصر کی بودوباش کا انحصار دریاے نیل پر تھا اس لیے انھیں سالانہ سیلاب کے دوران اس کی مختلف سطحوں کا بھی معائنہ کرنا پڑتا تھا۔ دریائی پانیوں کی اونچائی کی پیمائش کے لیے حاکم کے پاس ''نائلومیٹر'' ہوا کرتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے سرکاری کارندے نامزد کیے ہوئے تھے۔

پراسرار تعمیراتی ٹکنالوجی
A Construction Technology Full of Secrets

قدیم مصر میں تعمیر شدہ سب سے اہم عمارت وہ پراسرار اہرام ہیں جو زائرین کو آج بھی ورطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ان میں سب سے پر شکوہ وہ ہرم عظیم ہے جس کو تاریخ عالم میں سب سے بڑے پتھر کی بنی ہوئی عمارت تصور کیا جاتا ہے۔ تاریخ داں اور ماہرین

آثار قدیمہ نے ہیروڈوٹس (Herodotus) کے دور سے لے کر اب تک اس تعمیر ہرم کے سلسلہ میں مختلف نظریے پیش کیے ہیں۔ بعض نے اس بات کی تائید کی ہے کہ اس کی تعمیر میں غلاموں کو استعمال کیا گیا ہے، اور ڈھلوان والے طریقہ کار سے لے کر ڈھلان کے بالائی چبوترے والے ہرم تک کئی مختلف ممکنہ طریقہ کار تجویز کیے گئے ہیں۔ ان فرضی طریقوں سے جو تصویر مکمل ابھر کر آتی ہے وہ یہ ہے :

- اگر اس ہرم کو غلام بنائے ہوتے تو ان کی تعداد غیر معمولی طور پر کم وبیش دو لاکھ چالیس ہزار کے قریب ہوتی۔
- اگر ہرم بنانے کے لیے ڈھلوان بنائی گئی ہوتی تو پھر اس کو اتارنے کے لیے تقریباً آٹھ سال کی مدت درکار ہوتی۔
- یہ نظریہ ڈنمارک کے سول انجینئر گارڈ ہنسن (Garde-Hanson) کے مطابق مضحکہ خیز ہے۔ کیوں کہ ایک دفعہ ڈھلوان اتارنے کے بعد اس میں بڑے کھردرے پتھروں کے تختے ضرور چھوٹ گئے ہوتے۔ مگر کسی بھی جگہ اس قسم کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

گارڈ ہنسن نے ان پہلوؤں پر غور کیا ہے جن کا دوسرے نظریہ سازوں نے غلط اندازہ لگایا ہے۔

مصطفی غزالہ اپنی کتاب ”Historical Deception: The Untold Story of Ancient Egypt“ (تاریخی فریب : قدیم مصر کی ان کہی کہانی) میں بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہے :

ہرم کی زیارت کے دوران ان جھلملاتے ہوئے ہندسوں کی تصویر کو ذہن میں بٹھانے کی کوشش کریں: تقریباً چار ہزار سال قبل پتھر کے کان کن دن میں تین سو تیس پتھر کے تختے بناتے ہیں، سیلاب کے موسم میں ایک روز میں چار ہزار تختے دریائے نیل تک پہنچا کر گھاٹ کی کشتی میں پار کیے جاتے ہیں، الجیزا (Giza) کی سطح مرتفع پر واقع ڈھلوان کی طرف منتقل کر کے مرکزی مناسب جگہ

میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ایک منٹ میں چھ اعشاریہ چھ سات تختے کی شرح سے!
ہر ساٹھ سکنڈ میں چھ اعشاریہ چھ سات تختوں کا تصور کریں!۔
-مزید برآں یہ حقیقت بھی پردۂ ذہن پر جمائیں کہ ہر ہرم کے سامنے کا سطحی رقبہ تقریباً پانچ اعشاریہ پانچ ایکڑ ہے۔پھر ہر سطح کے لیے تقریباً ایک لاکھ پندرہ ہزار باہم منضم ہوجانے والے پتھر درکار تھے۔یہ پتھر ایسے محتاط اندازے کے ساتھ اپنی جگہوں پر رکھے گئے ہیں کہ ان کے درمیان ایسا معمولی سا خلا کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی اس کے اندر داخل نہیں ہوسکتا۔ ۵۴

یہ محض چند وہ اعتراضات ہیں جو اہراموں کی تعمیر سے متعلق ان رازوں کو دکھاتے ہیں جن کے جوابات سے اکیسویں صدی کی سائنس اور ٹکنالوجی ابھی تک قاصر ہے۔

اگر کوئی ان اہراموں کو ازسرِ نو تعمیر کرنا چاہے۔۔۔

If One Wished to Rebuild the Pyramids...

چونے کے پتھر کی بابت عالمی شہرت رکھنے والا سند یافتہ ادارہ (Indiana Limestone Institute of America, Inc.) نے -۱۹۷۸ء- میں اس کے قابل عمل ہونے کے سلسلہ میں ایک ذہنی آزمائش کرایا تاکہ یہ جانا جاسکے کہ الجیزا کے ہرم کے مشابہ ہرم بنانے کے لیے کس قدر افرادی قوت، اور کس قسم کے مواد درکار ہوں گے۔کمپنی کے اہل کاروں نے درپیش مشکلات کا ذکر یوں کیا کہ اگر وہ آج کی اوسط پیداوار تین گنا زیادہ کردیں، اتنی ہی مقدار کے چونے کے پتھر کی کان کنی، ان کی تختہ سازی اور بذریعہ جہاز انھیں منتقل کرنے میں تقریباً ستائیس سال لگ جائیں گے۔مزید برآں یہ تمام کام جدید امریکی ٹکنالوجی ماقوائی ہتھوڑے اور بجلی کے بلوری سروں والے آرے کے استعمال کرکے بھی محض چونے کے پتھر کی کان کنی اور ان کے نقل وحمل میں بہت بڑی محنت درکار ہوگی ۔اس میں تجربہ گاہ میں ان مواد کی آزمائشیں شامل نہیں ہیں جو ہرم کی تعمیر کے لیے ضروری ہیں اور نہ اس قسم کی دوسری ابتدائی سرگرمیاں۔

پھر کس طرح قدیم مصریوں نے ان عظیم ہرموں کو بنایا۔ کس طاقت سے، کس مشینری سے اور کن آلات کی مدد سے یہ پتھریلے چبوترے تیار کیے گئے۔ کن وسائل سے ان سنگی مقبروں پر نقش نگاری کی گئی، تعمیر کے دوران روشنی کا بندوبست کس طرح کیا گیا، (دیواروں یا اہرام اور مقبروں کی اندرونی چھتوں پر کسی داغ ودھبے کے آثار نظر نہیں آتے) کانوں سے پتھروں کے یہ تختے کیسے نکالے گئے، مختلف اشکال والے ہموار تختے کیسے بنائے گئے، ان تختوں کو جن میں سے بعض وزن کا وزن کئی ٹن ہے کیسے منتقل کیے گئے، ان کو ۱/۱۰۰۰ سینٹی میٹر کی درستی کے ساتھ کس طرح آپس میں ایک ایسی ترتیب کے ساتھ فٹ کر دیا گیا۔ سوالات کی یہ فہرست کافی لمبی ہوسکتی ہے، تو انسانی تاریخ کی بابت ارباب ارتقا کے باطل نظریات کے ذریعہ کسی منطقی یا معقول اندازے سے کیا ان کے جواب دیے جاسکتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔

قدیم اہل مصر نے فن، طب اور ثقافت کو ترقی دے کر ایک عظیم تہذیب کی بنیاد ڈالی، ان کے چھوڑے ہوئے فن پارے، ان کے استعمال کردہ طبی طریقہ علاج اور ان کے حاصل کردہ علم وتجربے، ان اہم ثبوتوں میں سے چند ہیں۔ بعض سائنس داں آج بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جو فن پارے اہل مصر نے بنائے وہ درحقیقت غیر ارضی مخلوق کے تعمیر کردہ ہیں، اور تاریخ ارتقا کے مطابق ہرموں کی تعمیر اہل مصر کے لیے انتہائی مشکل ہوئی ہوگی۔

اس قسم کا کوئی بھی دعویٰ استثنائی طور پر یقیناً غیر معقول اور غیر منطقی ہے، مگر ارباب ارتقا اس کی آڑ لے اس لیے لیتے ہیں کہ ان کے تمام جذباتی بیانات ان حقائق کی کوئی بہتر تعبیر کرنے سے قاصر ہیں۔ پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے دعوے کی تائید کے لیے کوئی معمولی ترین شہادت بھی نہیں ہے۔ جب ارباب ارتقا سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی اتفاق یا خیالی ارتقائی طریقہ کار کی بنیاد پر کوئی تاویل وتشریح پیش نہیں کرسکتے تو وہ فوراً ''خلائی مخلوق'' کے نظریے کی آڑ لے لیتے ہیں۔ یقیناً انھوں نے اس مضحکہ خیز نظریہ کو محسوس کرتے ہوئے اس وقت پیش کیا کہ خلیہ کے اندر موجود ڈی این اے اور زندگی کے لیے سنگ بنیاد کا کام کرنے والا سب سے پہلا لحمیات ایسا پیچیدہ اور غیر معمولی ساختوں کا حامل ہے کہ جس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی غیر ذی روح مادے سے اتفاقیہ نکل آیا ہے۔ اور اس طرح

خلائی مخلوق زمین پر کوئی پہلا جاندار وجود لائی ہوگی اور اپنے پیچھے چھوڑ گئی ہوگی۔ یہ مضحکہ خیز دعوے ان قصوں میں سے ہیں جو نظریہ ارتقا کے مایوسانہ موقف کی غمازی کرتے ہیں۔

قدیم مصر کی تاریخ وتہذیب اور دیگر جملہ تہذیبوں کی بنیاد عقل ودانش اور قوت ارادی رکھنے والے افراد نے رکھی۔ آج ہم تین ہزار سال پہلے کی تاریخ رکھنے والے فن پاروں کو دیکھ کر حیراں وششدرر ہ جاتے ہیں اور اس میدان کے ماہرین اور سائنس دان اس بحث میں الجھے نظر آتے ہیں کہ انھوں نے یہ فن پارے کس طرح معرض وجود میں لائے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ آج تک اپنے نشانات محفوظ رکھنے والی پانچ ہزار سال پہلے کی تہذیب کی بنیاد انھوں نے ہزاروں سالوں میں اکٹھے کیے گئے گہرے علم وتجربہ سے رکھی۔ بالفاظِ دیگر اس قدیم تہذیب کی جڑیں اس سے بھی زیادہ آگے جاتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بالکل ابتدائی ادوار میں فرسودہ اور نیم جانور انسان نہیں تھے جو بول چال کی قوت سے محروم اور محض شکار پر اپنا گزر معاش کیا کرتے تھے جیسا کہ تاریخ ارتقا کا نظریہ پیش کرنے والوں نے دعویٰ کیا ہے۔ حالاں کہ انسان اپنی تخلیق کے روزِ اول ہی سے آج کے انسانوں کی طرح ذہانت، ذوق جمال، فہم وفراست، ضمیر، اخلاقی اقدار جیسے انسانی صفات سے متصف رہا ہے۔

سومری تہذیب
The Sumerian Civilization

انسانی تاریخ کے خیالی ''ارتقائی مارچ'' بیان کرتے ہوئے ڈارون کے نظریے کی تائید کرنے والے سائنس داں انسانی دماغ والے موضوع پر بالکل بے بس ولاچار نظر آتے ہیں جس کی مدد سے انسان نے یونیورسٹیاں، ہسپتال، کارخانے، ریاستیں، موسیقی کی دھنیں، اولمپک گیم کا انعقاد، اور خلائی سفر کیا ہے غرض کہ دماغ انسانی وہ طرۂ امتیاز ہے جو آدمی کو درجہ انسانیت پر فائز کردیتا ہے۔

ارباب ارتقا اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانی ذہن نے چمپانزی بندر سے نکل کر

آدمیت کی طرف ارتقا کرتے ہوئے حالیہ صلاحیتیں اپنے اندر جذب کرلیں اور اب وہ بندر ہمارا نام نہاد قریب ترین زندہ رشتہ دار ہے۔وہ ذہنی ارتقا میں واقع شدہ ان مبینہ مراحل کی نسبت دماغ میں واقع ہونے والے ان غیر شعوری تغیرات اور اوزار بنانے والی مہارت کی بہتری کی طرف کرتے ہیں۔ٹیلی وژن کے دستاویزی پروگراموں، اخبارات وجرائد کے مضامین میں اس سے ملتے جلتے ان کے اکثر دعوے آپ کے نگاہوں سے گزریں گے جو اس بندر والے انسان کے بارے میں لمبی کہانیاں بتاتے ہیں جس نے پہلی دفعہ پتھر کے چاقو اور بعد میں نیزے بنانا سیکھا مگر یہ پروپیگنڈہ بالکل بے بنیاد ہے۔اگرچہ اس ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں کہ اس منظر نامے کا ایسا خاکہ پیش کردیں کہ وہ سائنسی روپ دھارے نظر آئے ۔لیکن درحقیقت وہ سائنسی بنیاد سے عاری محض ڈارون کے تجویز کردہ نظریات پر مبنی ہیں۔ ان میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ انسانی ذہن کسی مادے تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔مادیت کی تردید کو آشکار کرتے ہوئے یہ حقیقت دماغی ارتقا سے متعلق ہر دعوے کی مکمل طور پر تغلیط کردیتی ہے۔

ارباب ارتقا یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانی دماغ ارتقا کے ذریعہ ابھر کر آیا ہے،لیکن ان کے پاس اس تجربہ کا کوئی ایسا وسیلہ نہیں ہے کہ جس سے وہ ابتدائی درجہ کی ذہانت کا اندازہ کرسکیں، اور نہ انھیں فرضی ارتقائی عمل میں نقل حالات وشرائط ہی کا کوئی علم ہے۔ ارتقائی مضامین کے لیے شہرت یافتہ، رسالہ 'نیچر' کا مدیر اعلیٰ ہنری جی (Henry Gee) نظریہ ارتقا کا حامی ہونے کے باوجود ایسے دعوؤں کی غیر سائنسی فطرت کو برسر عام قبول کرتا ہے :

> مثال کے طور پر انسان کے ارتقا کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ اس کے انداز نشست وبرخاست میں بہتری، دماغی جسامت اور دست وچشم کے مابین ارتباط سے ہوکر آیا ہے۔اور زبان کے استعمال، اوزار کی بناوٹ اور آگ جلانے جیسے فنی کامیابیوں کے لیے پیش خیمہ ثابت ہوا،لیکن ایسے منظر نامے محض خیالی ہیں۔ان کو کبھی کسی تجربے کے ذریعہ آزمایا نہیں جاسکتا اور اس طرح یہ غیر سائنسی

ہیں۔ان کا بھروسہ سائنسی آزمائش کے تواتر پر نہیں بلکہ اپنے موقف کے دعویٰ و سند پر ہوتا ہے۔۶۱

غیر سائنسی ہونے کے علاوہ اس طرح کے منظر نامے منطقی طور پر بھی بے بنیاد ہوتے ہیں۔ارباب ارتقا اس بات کی حمایت کرتے ہیں کہ فرضی طور پر ارتقا کے راستے سے آنے والی ذہانت کے وسیلے سے اوزار استعمال کرنے کی قابلیت ابھر کر ترقی کرنے لگی جس کے باعث آگے چل کر انسانی ذہانت میں بہتری آئی ،مگر اس قسم کی ترقی محض اس وقت ممکن جب کہ انسانی ذہانت پہلے ہی سے موجود ہو۔اس توجیہ کے مطابق ٹکنالوجی یا دماغ میں سے ارتقا کے ذریعہ کون پہلے ابھر کر آیا تو یہ سوال تاہنوز تشنہ جواب ہے۔

ڈارونزم کے مشہورومعروف نقادفلپ جانسن(Phillip Johnson)اس موضوع پر لکھتا ہے :

> ذہن انسانی کا اختراع شدہ نظریہ کبھی بھی اس دماغ کی بھرپور تشریح نہیں کرسکتا جس نے اس نظریے کو بنایا،عظیم سائنسی دماغ کی کہانی جو مطلق حقیقت کو دریافت کرتی ہے محض اس وقت اطمینان بخش ہے جب ہم خود ذہن کو تحفۂ قبول کرلیں ۔ایک دفعہ جب ہم اپنی دریافتوں کی پیداوار کی حیثیت سے دماغ کی تشریح کی کوشش کرتے ہیں تو ہم خود کو ایک ناقابل خروج شیش محل میں بند پاتے ہیں۔۶۲

ڈارونسٹ اپنے انسانی دماغوں کی توجیہ پیش کرنے سے بالکل قاصر ہیں ،یہ حقیقت آشکار کرتی ہے کہ انسانی ثقافت اور معاشی تاریخ کے بارے میں ان کے دعوے بھی غلط ہیں۔یقیناً تمام حقائق اور دریافتیں جن کا ہم نے اب تک جائزہ لیا ہے ''ارتقا کی تاریخ'' کے بارے میں ڈارونسٹوں کے دعوؤں کو بالکل بے معنی بنادیتی ہیں۔

ارباب ارتقا کے دعوؤں کے برعکس انسانی تاریخ ان شواہد سے بھری پڑی ہے کہ قدیم لوگوں کے بارے میں جیسا تصور کیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ ٹکنالوجیاں اور تہذیبیں موجود تھیں ،ان مشہور تہذیبوں میں سے ایک سومری تہذیب ہے،ان کے چھوڑے ہوئے فن پارے ہزاروں سال پہلے انسانوں کے حاصل کردہ علم کے چند ثبوت ہیں۔

سومری ایک ترقی یافتہ تہذیب

The Sumerians: An Advanced Civilization

یونانی زبان میں میزوپوٹیمیا (Mesopotamia) کا مطلب ''مابین النہرین'' کا علاقہ ہے۔ یہ دنیا کا وہ زرخیز ترین خطہ ہے جسے عظیم تہذیبوں کی آماجگاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔آج کویت اور شمالی سعودی عرب کے نام سے مشہوران آراضی کے جنوب میں ابھر کرآنے والے ایک قبیلہ کے لوگ جو دوسرے معاشروں سے مختلف زبان بولا کرتے تھے، شہروں میں رہتے، قانونی ڈھانچے کی بنیاد پر ملوکیت کا دار دورہ تھا، اور قرطاس وقلم کا استعمال کیا کرتے تھے، یہ وہ سومیری قبیلہ تھا جو تین ہزار سال قبل مسیح عظیم شہری ریاستوں کی بنیاد رکھ از جلد بام ترقی فائز ہو گئے، اور اپنی قلم روِ سلطنت میں بہت سی قوموں کو داخل کر لیا۔ ۶۳

یہ الگ بات ہے کہ پھر بعد میں اکادیان نے سومریوں کو شکست دے دی، اور وہ ان کے زیر اثر آ گئے تاہم سومری ثقافت، مذہب، فن، قانون، ریاستی ڈھانچہ اور ادب کو اپناتے ہوئے قوم اکادیان مابین النہرین میں اپنی تہذیب کو محفوظ کرنے کے قابل ہوگئی۔

اپنے دور میں سومریوں نے ٹکنالوجی سے لے کر فنون لطیفہ، اور قانون سے لے کر ادب تک تمام میدانوں میں اہم ترقیاں کیں، ان کے یہاں ایک مکمل ترقی یافتہ تجارت اور مضبوط اقتصاد موجود تھا۔ کانسی کے فن پارے، پہیوں والی گاڑیاں، بادبانی کشتیاں، مجسّمے اور یادگار عمارتیں ان کی پیش رفتہ ترقی کے چند شواہد ہیں جو آج تک باقی ہیں۔ مزید برآں سومری اپنے وقت کی بہت سی دست کاریوں میں مہارت کے لیے بھی مشہور ہیں۔ ان کی رنگائی اور بنائی مابین النہرین والے شہروں کا ایک اہم برآمدی سامان تھی، ان کے ایجاد کردہ فنون لطیفہ میں سے ایک اس کا بھی حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ ۶۴

سومریوں کا ایک ترقی یافتہ معاشی ڈھانچہ بھی تھا، ان کی ریاست، ملوکیت پر مبنی تھی، جس میں پادری بادشاہ ہوتا تھا، اور سرکاری افسروں کی مدد سے نظام حکومت چلاتا تھا، فصل کی کٹائی کے بعد لوگوں میں اس کی پیداوار تقسیم ہو جاتی تھی، اور کھیتوں پر جا کر اس کا معائنہ

کیا جاتا تھا۔سومری حکومت کے انتظام وانصرام کی بنیاد نوکرشاہی پرتھی۔ہرعلاقے خصوصا بڑے شہروں میں پادری وہاں پر موجود لوگوں کی دیکھ بھال کرتا تھا،اور غذائی مواد کی منصفانہ تقسیم کی یقین دہانی کراتا تھا پادریوں کی ان کاروائیوں کو قلم بند کر کے محفوظ کرلیا جاتا تھا۔

ہمارے دور سے تقریبا پانچ ہزار سال قبل آباد سومری تہذیب کی معاشی،فنی،سائنسی اور اقتصادی میدانوں میں پیش رفت فرضی طور پر فرسودہ دور سے ترقی یافتہ دور کی طرف انسان کے اس ارتقائی ماڈل سے بالکل برعکس ہے۔سومریوں کی بنائی ہوئی وہ عظیم تہذیب نہ صرف اپنے ہی دور میں غیر معمولی طور پر ترقی یافتہ تھی بلکہ ہمارے آج کے دور کے بہت سے عظیم معاشروں کے مقابلے میں بھی قابل غور حد تک پیش رفتہ تھی۔

ثقافتی ترقی کے اس درجے کی تشریح ارباب ارتقاکے ان دعوؤں سے نہیں کی جاسکتی جن میں یہ کہا گیا ہے کہ انسانوں نے پہلے بندر جیسی صفات اور آپس میں بھنبھناہٹ کے انداز میں گفت وشنید سے خود کو نجات دلائی،پھر بعد میں انھوں نے اجتماعی زندگی کی بناڈالی، جانور پالنے شروع کیے اور کاشت کاری کرنا سیکھا۔یہ واضح ہے کہ انسان تاریخ کے جملہ ادوار میں اپنی تمام ذہانت،قابلیت اور ذوق سلیم کے ساتھ ہمیشہ انسان ہی رہے ہیں۔ارباب ارتقاکے بندر نما انسانوں کے بارے میں پیش کردہ وہ تمام خاکے جھوٹے اور تاریخی وسائنسی حقائق سے عاری ہیں جن میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان غاروں میں آگ کے قریب بیٹھا ہوا،خام پتھر کے اوزار بناتا ہوا اپنا گزر اوقات کررہا ہے۔

سومری سائنس

Sumerian Science

سومریوں کے ہندسوں کا اپنا ایک اچھوتا انداز تھا۔آج کے نظام اعشاریہ **(Decimal)** کی بجائے ان کا ریاضیاتی نظام ساٹھ والے **(Sexagesimal)** عدد پر مبنی تھا۔ہمارے آج کے اس دور میں ان کا یہ نظام اس اعتبار سے ایک اہم مقام رہتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ساٹھ منٹ،ایک منٹ میں ساٹھ سیکنڈ،اور ایک دائرے میں تین سو ساٹھ

درجے ہوتے ہیں ۔ان وجوہات کی بنیاد پر سومریوں کو اپنے ریاضیاتی علم سے بنیادی جیومیٹری اور الجبرا کے فارمولے بنانے کے باعث' جدید ریاضیات کے بانیوں کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔

مزید برآں سومریوں نے علم فلکیات میں نسبتاً ایک پیش رفتہ درجہ حاصل کیا تھا، اور سالوں، مہینوں اور دنوں کے بارے میں ان کے اعداد و شمار بعینہٖ ہماری طرح ہیں ۔بارہ مہینوں پر مشتمل سومری جنتری کو قدیم مصریوں، یونانیوں اور بہت سے سامی معاشروں نے بھی استعمال کیا۔اس جنتری کے مطابق سال صرف دو موسموں یعنی موسم سرما اور گرما پر مشتمل ہوتا ہے۔موسم گرما اعتدالِ ربیعی پر اور موسم سرما اعتدال خریفی پر شروع ہوتا تھا۔

سومری 'ذی الگراۃ'(Ziggurats) کے نام سے موسوم اپنے برجوں سے فلکیات کا مطالعہ کرتے تھے۔وہ سورج اور چاند گرہنوں کی پیش گوئی کے قابل تھے، اور بہت سے دستاویزوں میں اس کا واضح ثبوت مل سکتا ہے ۔اپنی فلکیاتی دریافتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے سومریوں نے ستاروں کے بہت سے مجموعوں کے نقشے بنائے ، چاند اور سورج کے علاوہ انھوں نے عطارد، زہرا، مریخ، مشتری اور زحل کی حرکات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کا ذکر کیا ۔سومریوں نے جو اعداد و شمار پانچ ہزار سال قبل پیش کیے تھے ان کی آج خلائی جہازوں سے زمین پر بھیجی گئی تصویروں سے تصدیق ہو گئی ہے۔

بلاشبہہ یہ ارتقائی تاریخ کے دعوؤں کے بالکل متضاد ہے۔ہم بنیادی طور پر پانچ ہزار سال پہلے دریافت کی گئی ان معلومات کی طرف دیکھ رہے ہیں جن کو آج ہم نے بڑے بڑے دوربینوں، پیش رفتہ کمپیوٹروں اور گوناگوں قسم کی ٹکنالوجیوں کی مدد سے دوبارہ حاصل کیا ہے ۔اگر معاملہ یوں ہے تو ارتقا والے سائنس دانوں کو اپنے تجویز کردہ نظریات کو یک طرف کر کے سائنسی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں اس کی تحقیق کرنی چاہیے۔یہ حقیقت اس نظریے کے بطلان کو بے نقاب کرتی ہے جس کی حمایت ڈاروِنسٹ کرتے ہیں کہ تہذیبیں فرسودہ سے ترقی یافتہ کی طرف ہمیشہ ارتقا کرتی آئی ہیں ۔ارتقا کے فرضی تناظر میں کچھ نظریاتی دلچسپیاں اس انسان کی تاریخ کی توجیہ کے پس پردہ موجود ہیں جو تہذیبوں کی بنیاد رکھتا،

موسیقی سازی کرتا،فن پاروں کو ایجاد کرتا،دل کش عمارتوں کی تعمیر کرتا،خلا کی سیر کرتا اور سائنس اور ٹکنالوجی کی دریافتیں کرتا ہے۔ لہٰذا سائنس دانوں کو ان حقائق کی روشنی میں اپنا صحیح کردار ادا کرنا ہوگا جن کا تعین' تجربہ،دریافت اور مشاہدہ کرتا ہے نہ کہ نظریاتی دلچسپیاں۔

تاریخ ارتقا کے بطلان کے لیے ایک دوسری تہذیب' المایا

The Mayans : Another Civilization That Refutes the Idea of the Evolution of History

نظریہ ارتقا کے متعلق تمام اشاعتوں میں ایک نکتہ قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے: ان سبھوں نے ان خیالی منظر ناموں کو قابل غور جگہ دے رکھی ہے کہ کسی ذی روح حیاتیاتی ساخت یا صفت کی کیوں اور کیسے ارتقا ہوئی ہے۔ ارباب ارتقا کے گڑھے ہوئے تمام قصوں میں ایک حیران کن عنصر یہ ہے کہ وہ ان کو سائنسی حقائق کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ تاہم سچی بات یہ ہے کہ یہ توجیہات ڈارون کی جھوٹی کہانیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ارباب ارتقا کا جن منظر ناموں سے واسطہ پڑتا ہے ان کو وہ سائنسی دلائل کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر یہ توجیہات مکمل طور پر گمراہ کن، سائنسی نقطہ نظر سے نا قابل قبول اور نظریہ ارتقا والے دعوؤں کی خاطر دلیل فراہم نہیں کرسکتیں۔

ارباب ارتقا کے ادب پارے میں اکثر و بیشتر ملنے والا ایک قصہ یہ ہے کہ مبینہ انسانوں میں بدل جانے والی بندر نما مخلوق انسانوں میں تبدیل ہوگئی اور پھر فرسودہ انسان آہستہ آہستہ ایک اجتماعی ہستی بن گیا مگر ان کی حمایت کے لیے ان کے پاس کوئی سائنسی ثبوت نہیں ہے۔ ان فرضی فرسودہ انسانوں کی تعمیر نو اس منظر نامے کے مشہور ترین حصے ہیں۔ جن میں ان کو نیم سیدھے انداز میں کھڑے ہوتے بھنبھناتے ''اپنے غاروں والے خاندانوں'' کے ساتھ چلتے اور خام پتھر کے اوزار سے شکار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔
یہ نئی تعمیریں تصور و عقیدہ کو مہمیز کرتی ہیں ۔ ارباب ارتقا ٹھوس حقائق کی بنیاد پر نہیں

بلکہ محض خیالی قیاس آرائیوں پر لوگوں کو ان باتوں کی یقین دہانی کرانے کی کوشش کرتے ہیں کیوں کہ یہ سائنسی حقائق کی بجائے اپنے مصنفوں کے تعصب اور پہلے سے قائم کردہ نظریات پر مبنی ہوتے ہیں۔

ارباب ارتقا ان توجیہات کے خلاف فطرت ہونے پر مطلع ہو کر بھی ان قصوں کو پیشہ ورانہ ادب میں محفوظ کرنے اور سائنسی حقائق کے طور پر پیش کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ تاہم ان منظر ناموں کو ارباب ارتقا اکثر اچھالتے رہتے ہیں، لیکن وہ نظریہ ارتقا کے لیے قیاس آرائیوں کے علاوہ سائنس سے کوئی ثبوت فراہم نہیں کرسکتے کیوں کہ اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ انسان بندر جیسے آباؤ اجداد سے ہو کر آیا ہے۔ اسی طرح کسی قسم کی آثار قدیمہ یا تاریخی شہادت یہ تجویز نہیں کرتی کہ معاشرے فرسودہ سے ترقی یافتہ کی طرف ارتقا کرکے آئے ہیں، انسان اپنی ابتدا سے لے کر اب تک انسان ہی رہا ہے، اور اس نے مختلف تہذیب و ثقافت کو تاریخ کے مختلف ادوار میں جنم دیا ہے۔ انھیں میں سے ایک المایا تہذیب بھی ہے، جس کے باقیات آج تک سامانِ حیرت ہیں۔

تاریخی وسائل ایک سفید لبادہ میں ایک لمبے شخص کا حوالہ دیتے ہیں جو اس علاقے میں موجود لوگوں کے پاس آیا، ان یادگاروں کے کتبوں سے فراہم شدہ معلومات کے مطابق خدائے واحد پر عقیدہ ایک مختصر مدت کے لیے پھیلتا رہا ساتھ ہی سائنس اور فنون میں ترقی ہوتی رہی۔

قوم المایا : ماہر ریاضیات

The Mayans: Expert Mathematicians

قوم المایا ایک ہزار سال قبل دوسری ترقی یافتہ تہذیبوں مثلاً اہل مصر، اہل یونان اور مابین النہرین والوں سے کافی دور، مرکزی امریکہ میں آباد تھی۔ قوم المایا کے خصوصی امتیازات ان کی سائنسی ترقیاں ہیں جو انھوں نے اپنی پیچیدہ محررہ زبان، فلکیات اور ریاضیات کے میدانوں میں کیں۔

قوم المایا وقت،فلکیات اور ریاضیات کے بارے میں اپنا علم دنیائے مغرب کے علم سے ایک ہزار سال پہلے استعمال کرتی تھی۔مثال کے طور پر زمین کی سالانہ گردش کے بارے میں ان کے اعداد وشمار کمپیوٹر کی ایجاد سے پہلے اس قسم کے دوسرے اعداد وشمار سے کہیں زیادہ صحیح تھے۔المایا قوم'صفر کے ریاضیاتی نظریے کو مغربی ریاضی دانوں کی دریافت سے ایک ہزار سال پہلے استعمال کرتی تھی ، اور اپنے معاصرین سے زیادہ ترقی یافتہ اعداداور اشاریوں کا ان میں دوردورہ تھا۔

المایا جنتری

The Mayan Calendar

تین سوپینسٹھ ۳۶۵دنوں پر مشتمل' المایا کی استعمال کردہ شہری جنتری ہاب (Haab) ان کی ترقی یافتہ تہذیب کی پیداوار میں سے ایک ہے۔بلاشبہہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ایک سال ۳۶۵دنوں سے کچھ زیادہ ہوتا ہے ،ان کا اندازہ تین سو پینسٹھ اعشاریہ دو چار دو صفر تین چھ، دن تھے۔آج کی زیر استعمال عیسوی جنتری میں سال تین سو پینسٹھ اعشاریہ دو چار دو پانچ ،دنوں پر مشتمل ہے۔جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں ان دو اعداد کے درمیان ایک بہت ہی معمولی فرق ہے جو ریاضیات اور فلکیات کے میدانوں میں المایا قوم کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

المایا کا علم فلکیات

The Mayans' Knowledge of Astronomy

قوم المایا نے ہمیں تین کتابوں کا عظیم ورثہ ہمیں دیا ہے جو ان کے طرزِ زندگی اور فلکیات علم کے بارے میں اہم معلومات پر مشتمل ہیں اور مایہ کوڈکسز (Maya Codices) کے نام سے مشہور ہیں۔-میڈرڈ کوڈکس، پیرس کوڈکس، ڈرسڈن کوڈکس-ان

تین میں سے موخرالذکر فلکیات کے بارے میں المایا قوم کے علم کی گہرائی دکھانے کے سلسلے میں بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ ان کے طرز تحریر کا ایک بہت ہی پیچیدہ نظام تھا جس کو محض تیس فیصد سے بھی کم سمجھا جاسکا ہے، مگر یہ ان کے حاصل کردہ سائنسی ترقی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔

مثال کے طور پر ڈرسڈن کوڈکس کا گیارہواں صفحہ زہرا سیارے کی معلومات پر مشتمل ہے۔ المایا قوم نے زہرا کے سال کو پان سو تراسی اعشاریہ نو دو، دنوں پر مشتمل ہونے کے اعداد و شمار نکالے تھے، اور اس کو ذرا سا بڑھا کر پانچ سو چوراسی دنوں میں مکمل کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہزاروں سالوں پر محیط اس سیارے کی گردش کے نقشے بنائے تھے۔ اس کوڈکس کے دو دوسرے صفحات مریخ کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں، چار مشتری اور اس کے سیارچوں کے بارے میں اور آٹھ صفحات چاند، عطارد اور زحل کے بارے میں۔ مثلاً سورج کے گرد ان سیاروں کا مدار، آپس میں ان کا ربط و تعلق، زمین کے ساتھ ان کی وابستگی کے پیچیدہ اعداد و شمار تیار کیے گئے ہیں۔

اس طرح فلکیات کے بارے میں المایا قوم کا علم نہایت دقیق تھا کہ وہ یہ متعین کرنے کے قابل تھے کہ زہرا کے مدار سے ہر چھ ہزار سالوں سے ایک دن گھٹانا ضروری ہے۔ انھوں نے یہ معلومات کیسے حاصل کیں؟ یہ اب تک فلکیات، فلکی طبعیات اور آثار قدیمہ کے ماہرین کا موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ آج محض کمپیوٹر ٹکنالوجی کی مدد سے اس قسم کے پیچیدہ اعداد و شمار کیے جاتے ہیں، سائنس دان ہر قسم کی فنی اور الیکٹرانی آلات سے لیس مشاہدہ گاہوں سے بیرونی خلا کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے ہوتے ہیں۔ مگر المایا قوم نے آج کی ٹکنالوجی کی ایجاد سے صدیوں پہلے اس علم کو حاصل کیا۔ یہ ایک دفعہ پھر اس نظریے کو غلط ثابت کرتا ہے کہ معاشرے ہمیشہ فرسودہ سے ترقی یافتہ حالت کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں۔ بہت سے گزرے ہوئے معاشرے آج کے موجودہ معاشروں کی طرح ترقی یافتہ بلکہ بسا اوقات تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ان سے کہیں زیادہ پیش رفتہ رہ چکے ہیں۔ کئی معاشروں نے ابھی تک وہ درجہ حاصل نہیں کیا جو ماضی کے معاشروں کو حاصل

تھا۔ مختصر یہ کہ تہذیبیں بعض اوقات ترقی کی طرف اور بعض اوقات تنزلی کی طرف رواں دواں ہوتی ہیں اور بسا اوقات ایک ہی وقت میں ترقی یافتہ اور فرسودہ دونوں تہذیبیں موجود ہوتی ہیں۔

قدیم المایا کے شہر تکال میں سڑکوں کا ایک جال

Network of Roads in the Ancient Mayan City of Tikal

تکال ان پرانے المایا شہروں میں سے ایک ہے جس کی آٹھ سو قبل مسیح میں بنیاد رکھی گئی تھی۔ ایک جنگل میں واقع اس شہر کی کھدائی کے دوران گھر، محلات، اہرام، عبادت خانے اور اجتماعی مراکز دریافت ہوئے ہیں۔ یہ تمام مقامات ایک دوسرے سے سڑکوں کے ذریعہ مربوط ہیں۔ ریڈار والی تصویریں دکھاتی ہیں کہ نکاسی کے نظام کے علاوہ شہر میں آب پاشی کا بھی ایک بہترین نظام تھا۔ تکال کے قریب نہ کوئی دریا ہے نہ کوئی جھیل۔ اور اس بات کا سراغ لگا ہے کہ شہریوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے پانی کے دس تالابوں کا استعمال ہوتا تھا۔ پانچ بڑے روڈ تکال سے جنگل کی طرف جاتے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ بیان کرتے ہیں کہ یہ خاص تقریبات کے لیے بنائی گئی ہیں۔ فضا سے لی گئی تصویریں دکھاتی ہیں کہ المایا شہر کی آبادیاں ایک دوسرے سے تقریباً تین سو کلومیٹر (۱۹۰ میل) لمبی اور بہترین انجینئرنگ کی نمائندگی کرنے والی سڑکوں کے ایک لمبے جال کے ذریعہ آپس میں مربوط تھیں۔ تمام سڑکیں پتھر کے ٹکڑوں سے بنائی گئی تھیں اور پھر ان پر ہلکے رنگ کے سخت کپڑے کی تہ چڑھائی گئی تھی، یہ روڈ مکمل طور پر سیدھے تھے جیسے کہ یہ ایک پیمانے پر بنائے گئے ہوں۔ اور یہ اہم سوالات زیر بحث رہتے ہیں کہ المایا کس طرح ان سڑکوں کی تعمیر کے دوران سمت کا تعین کرنے کے قابل ہوئے، اور وہ کس قسم کے اوزار و آلات استعمال کرتے تھے۔ ارباب ارتقا کی ذہنیت ان سوالات کے معقول اور منطقی جوابات فراہم نہیں کر سکتی کیوں کہ یہ انجینئرنگ کے ایک شاہکار سے متعلق ہیں۔ سیکڑوں کلومیٹر لمبی اور صاف وشفاف یہ سڑکیں دقیق اعداد وشمار، پیمائشوں اور ضروری مواد و آلات کے استعمال کا نتیجہ ہیں۔

المایا کے استعمال کردہ دندانے
Cogs Used by the Mayans

المایا کے آباد کردہ علاقوں کی تحقیق سے یہ واضح ہوا ہے کہ وہ دندانے دار پہیے والے آلات استعمال کیا کرتے تھے۔ المایا کے مشہور شہر کوپن (Copan) میں لی گئیں تصویریں اس کا ایک ثبوت ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جو دندانے دار پہیوں والی ٹکنالوجی کا استعمال کرتا تھا ان کے پاس میکینکل انجینئرنگ کا علم بھی ضرور ہونا چاہیے۔ اس علم سے عاری شخص کے لیے دندانے دار پہیوں والے آلات ایجاد کرنا ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر اگر تصویروں میں دکھائے گئے آلات کی طرح اوزار آپ سے بنانے کے لیے کہا جائے تو مناسب ٹریننگ کے بغیر آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ نہ اس بات کی یقین دہانی کرا سکتے ہیں کہ یہ آلہ صحیح طور پر کام بھی کرے گا۔ مگر المایا قوم یہ کرنے کے قابل ہوئی تو یہ ان کے علم کے اعلیٰ درجے کی ایک اہم نشانی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ ماضی میں رہنے والے لوگ ''پس ماندہ'' نہیں تھے جیسا کہ ارباب ارتقا دعویٰ کرتے ہیں۔

اب تک ہم نے صرف ان چند مثالوں کو لیا ہے جو ماضی میں معاشروں کے حاصل کردہ تہذیب کے ترقی یافتہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں: کئی سالوں سے عائدہ کردہ ارباب ارتقا کا یہ نظریہ کہ معاشرے ماضی میں بہت سے ہی سادہ، پس ماندہ اور فرسودہ زندگیاں گزارتے تھے محض غلط ہے۔ معاشرے تہذیب کے مختلف درجات اور مختلف ثقافتوں کے ساتھ ہر دور میں موجود رہے ہیں مگر ان میں سے کوئی دوسرے سے ارتقا کر کے نہیں آیا۔ یہ حقیقت کہ بعض پس ماندہ تہذیبیں ہزار سال پہلے موجود تھیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ تاریخ نے ارتقا کی ہے یا ان معاشروں نے فرسودگی سے ترقی کی جانب پیش رفت کی ہے کیوں کہ ان پس ماندہ معاشروں کے ساتھ وہ انتہائی ترقی یافتہ معاشرے بھی تھے جنھوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں اہم اقدامات کیے اور گہری جڑوں والی تہذیبوں کی بنیاد ڈالی تھی۔ ہاں! ثقافتی، باہمی تعامل اور حاصل کردہ علم نسلا بعد نسلٍ چلتا رہا، جو معاشروں کی ترقی ایک اہم کردار ضرور ادا کر سکتا ہے لیکن اسے

ارتقانہیں کہا جاسکتا۔

ماضی میں رہنے والے معاشروں کی مثالوں کا حوالہ دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے کہ ان میں سے بعض نے انتہائی ترقی یافتہ ثقافتوں کی بنیاد ڈالی ہے :

> تو کیا انھوں نے زمین میں سفر نہ کیا کہ دیکھتے کیسا انجام ہوا ان سے اگلوں کا ان کی قوت اور زمین میں جو نشانیاں چھوڑ گئے۔(سورۂ مومن؛۴۰/۲۱)
>
> کیا انھوں نے زمین میں سفر نہ کیا کہ دیکھتے ان سے اگلوں کا کیسا انجام ہوا، وہ ان سے بہت سے اور ان کی قوت اور زمین میں نشانیاں ان سے زیادہ تھیں تو ان کے کیا کام آیا جو انھوں نے کمایا۔(سورۂ مومن؛۴۰/۸۲)
>
> اور کتنی ہی بستیاں ہم نے کھپا دیں (ہلاک کردیں) کہ وہ ستم گار تھیں تو اب وہ اپنی چھتوں پر ڈہی (گری) پڑی ہیں اور کتنے کنویں بے کار پڑے اور کتنے محل گچ کیے ہوئے۔(سورۂ حج؛۲۲/۴۵)

قرآن کریم میں موجود ان بیانات کی آثار قدیمہ کی دریافتوں سے تائید ہو جاتی ہیں ۔جب آثار قدیمہ کی دریافتیں اور سابقہ معاشروں کی رہائشی جگہوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ دیکھنے آتا ہے کہ ان معاشروں میں سے اکثر آج کے موجودہ بعض معاشروں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے، اور انھوں نے تعمیراتی ٹکنالوجی ،فلکیات، ریاضیات اور طب کے میدانوں میں انتہائی ترقیاں کی تھیں۔ جو ایک بار پھر معاشرے اور تاریخ کے ارتقا والے ڈارون کے فرضی قصوں کو غلط ثابت کر دیتی ہیں۔

زبانِ ارتقا کی تعطّلی

The Impasse of Language Evolution

انسانی تاریخ کے ارتقا کے فرضی قصے کو بیان کرتے ہوئے ارباب ارتقا مختلف مسائل سے دوچار ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ کہ انسانی ضمیر کس طرح پہلی بار ابھر کر سامنے آیا، دوسرا مسئلہ سرچشمہ نطق کے بارے میں ہے ۔یہ ایک ایسی صفت ہے جو انسان کو

دوسرے ذی روحوں سے متمیّز کرتی ہے۔جب ہم بولتے ہیں تو زبان کی مدد سے ہم اپنے خیالات کوالفاظ کی شکل دیتے ہیں،اوران کا اظہاراس طریقے سے کرتے ہیں کہ مدمقابل سمجھ لیتاہے، اگرچہ اس کے لیے ہونٹوں ، گلے اورزبان کی انتہائی خصوصی عضلاتی حرکت درکار ہوتی ہے جس سے ہم بمشکل آگاہ ہیں۔

ہم محض بولنا'' چاہتے ہیں'' تو آوازیں، اشارے اور الفاظ سومختلف عضلات کے ہم آہنگی کے ساتھ سکڑنے اور پھیلنے سے ابھر کر سامنے آتے ہیں،اور دوسروں کے لیے قابل سمجھ جملے فاعل مفعول اوراسم ضمیر جیسےقواعدی عناصر کے مناسب تسلسل سے بنتے ہیں۔پیچیدہ مراحل پر مبنی ایسی اہلیت کواستعمال کرنے کے لیے ہم اپنے''ارادہ'' سے زیادہ کچھ نہیں کرتے۔یہ حقیقت واضح طور پر دکھاتی ہے کہ بولنا محض ایک اہلیت نہیں ہے جوضروری حیاتیاتی ساختوں سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔بولنے کی انسانی صلاحیت انتہائی پیچیدگی کا مظہر ہے جس کی توضیح خیالی ضرورتوں یاارتقائی عمل کے طریقہ ہائے کار کے اصطلاح میں نہیں کی جاسکتی ۔گہری تحقیق کے باوجود ارباب ارتقا کوئی ایسی دلیل فراہم نہیں کرسکے ہیں کہ بولنے جیسی انتہائی پیچیدہ قابلیت سادہ حیوانوں جیسی آوازوں سے ارتقا کر کے آئی ہے۔پنسل وینیا یونیورسٹی کا ڈیوڈ پریمیک (David Premack) اس ناکامی کواجاگر کرتے ہوے کہتاہے :

انسانی زبان ارتقائی نظریے کے لیےایک پریشان کن مسئلہ ہے۔٦٨

مشہور ماہرلسانیات ڈیرک بکیرٹن(Derek Bickerton) اس ''معمہ'' کے وجوہات کا خلاصہ یوں بیان کرتا ہے :

کیاایسا ہوسکتا ہے کہ زبان براہِ راست کسی ماقبل انسانی صفت سے ہوکرآئی ہو؟نہیں۔کیا یہ جانوروں کی آپس میں عرض ومعروض کی صورتوں سے مشابہ ہے؟ نہیں۔کوئی بھی بندرسخت ٹریننگ کے باوجود ابھی تک بولنے کے بنیادی قواعد حاصل نہیں کرسکا۔الفاظ کیسے ابھرآئے ، الفاظ کی ترکیب وترتیبکیسے وجود میں آئی۔ یہ مسائل زبان کے ارتقائی تہوں میں چھپے ہوئے ہیں ۔کرۂ زمین پر بولی

جانے والی تمام زبانیں پیچیدہ ہیں اور ارباب ارتقا یہ تصور کرنے کے بھی قابل نہیں ہیں کہ اس پیچیدگی کو کس طرح آہستہ آہستہ حاصل کیا جاسکا۔۶۹

نظریہ ارتقا کے ماہر حیاتیات رچرڈ ڈاؤکینس (Richard Dawkains) کے مطابق تمام زبانیں انتہائی پیچیدہ ہیں یہاں تک کہ انتہائی فرسودہ سمجھی جانے والی قبائلی زبانیں بھی۔

میری واضح مثال زبان ہے، کوئی بھی اس کے آغاز سے باخبر نہیں۔۔۔الفاظ ومعانی کے مفاہیم کا سرچشمہ یکساں طور پر مبہم ہے۔۔۔دنیا کی ہزار ہا زبانیں بہت پیچیدہ ہیں، میں اپنی یہ سوچ غلط ہے کہ یہ درجہ بدرجہ ہو کر آئیں ہیں۔ یہ کسی مخصوص وقت میں کسی خاص جگہ پر کسی انسان واحد کی ذہانت کی پیداوار نہیں ہیں۔۷۰

اریزونا اسٹیٹ یونیورسٹی کے انسانی دماغ پر تحقیق کرنے والے نظریہ ارتقا کے دو ماہرین ڈبلیو۔ کے۔ ولیمس (W.K.Williams) اور جے۔ ویکی فیلڈ (J.Wakefield) اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زبان کی ارتقا میں درمیانی مراحل کے لیے ثبوت کی عدم موجودگی کے باوجود ان کے لیے کوئی متبادل ڈھونڈنا مشکل ہے۔ اگر کسی خاص جنس کی کوئی خصوصی صفت تدریجی انداز میں ارتقا کر کے نہیں آئی تو پھر اس کے وجود میں آنے کی تشریح محض دو طریقوں سے کی جاسکتی ہے، یا تو اب تک کسی غیر معروف شاید الہامی قوت نے اسے برپا کیا، یا یہ اس جنس کی ترقی میں نسبتاً اچانک شاید کسی قسم کی ہمہ وقت اور وسیع وعریض تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس غیر متوقع تبدیلی کے ایسے وقوع کی فطرت اس کی تشریح کو مشکوک بنا دیتی ہے۔ جیسا کہ پنکر (Pinker) اور (Bloom)(۱۹۹۰ء) نے اجاگر کیا ہے کہ ایک زبان کی طرح کسی کام کے لیے بظاہر مثالی طور پر مناسب اور پیچیدہ نظام میں واقع ہونے والی تبدیلی کے خلاف مواقع حیران کن طور پر زیادہ ہوتے ہیں۔۷۱

لسانیات کے پروفیسر نوم چومسکائی(Noam Chomsky)بولنے کی صلاحیت کی پیچیدگی پر اپنا اظہار خیال یوں کرتا ہے :

اب تک میں نے زبان کی پیدائش کے بارے میں کچھ نہیں کہا وجہ یہ ہے کہ اس میں دلچسپی کا سامان بہت کم ہے۔اضافی پہلوؤں کے علاوہ یہ زیادہ تر صیغہ راز میں رہتا ہے۔۲۷

اگر کوئی شخص ارباب ارتقا کے قائم کردہ نظریات کا شکار نہ ہوا ہو تو ان کے لیے بولنے کی صلاحیت کا سرچشمہ پورے طور پر واضح ہے۔وہ خداوند قدوس کی ذات ہے جس نے انسان کو اس قابلیت سے مالا مال کیا ہے۔اللہ تعالیٰ انسانوں کو الہامی طور پر توفیق نطق سے نوازتا ہے۔جیسا کہ آیت قرآنی سے واضح ہے :

وہ کہیں گی ہمیں اللہ نے بلوایا جس نے ہر چیز کو گویائی بخشی اور اس نے تمھیں پہلی بار بنایا اور اسی کی طرف تمھیں پھرنا ہے۔(سورۂ فصلت:۴۱/۲۱)

اسی طریقے سے ارباب ارتقا بولنے کی صلاحیت کو اجاگر کرنے والی حیاتیاتی ساختوں کی پیچیدگی کی توجیہ کرنے سے قاصر ہیں،ساتھ ہی زبان کو ممکن بنادینے والے سرچشمہ ضمیر کی تشریح سے بھی قاصر ہیں۔انسانی ضمیر اور زبان کی پیچیدگیاں دکھاتی ہیں کہ یہ دراصل ہمارے خالق و مالک خداوند قدوس-عزوجل-کی حکمت کا شاہ کار ہے۔

ابتداے تاریخ سے سچے دین کا وجود

The True Religion has existed since the beginning of history

اس فریب کو ہوا دینے والوں کی ایک دوسری غلطی یہ ہے کہ تاریخ اور معاشرے ارتقا کر کے آئے ہیں۔ان کا یہ دعویٰ ہے کہ معاشرے کا سب سے قیمتی سرمایہ یعنی دین بھی ارتقائی مراحل سے گزر کر آیا ہے۔یہ دعویٰ انیسویں صدی میں پیش کیا گیا،اور مادہ پرستوں اور اہل الحاد نے پورے جوش و خروش سے اس کا ساتھ دیا ہے مگر کوئی ایسی اثریاتی دریافت

نہیں جواس کا جواز پیش کر سکے اور یہ محض قیاس آرائی کے قلم رو میں باقی رہ جاتی ہیں۔اور اس دعویٰ کو نہ کوئی ایسی حمایت حاصل ہے کہ ابتدائی ادوار کے انسان نام نہاد''فرسودہ'' قبائلی اور مشرکانہ مذاہب پر عمل پیرا تھے، نیز یہ کہ صحیح دین بعد میں وجود میں آیا حالاں کہ خدائے واحد کے عقیدہ پر مبنی دینحضرت آدم-علیہ السلام-کے وقت سے پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے نازل ہوا۔بعض ارباب ارتقاان دعووٗں کی خاکہ کشی تاریخی حقیقت کی حیثیت سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ اس سلسلے میں پورے پورے غلطی پر ہیں۔جیسا کہ حیاتیاتی ارتقاکے بارے میں ڈارون کا نظریہ ایک فریب ہے اسی طرح دینی ارتقا کا نظریہ بھی ایک فریب ہے، جس کا سررشتہ ڈارون کے نظریے سے جاملتا ہے۔

''دینی ارتقا'' کی غلطی کہاں سے آئی؟

How Did the "Evolution of Religions" Error Come About?

تقریباً ڈیڑھ صدی قبل جب ڈارون کی کتاب''**Origin of Species**'' (اجناس کا سرچشمہ) اپنے پہلے اڈیشن میں تھی تو نظریہ ارتقانے مادہ پرستوں اور ملحدوں کے درمیان کافی مقبولیت حاصل کی۔اس دور کے بعض مفکرین نے خیال کیا کہ تاریخ انسانی کے ہر واقعہ کی ارتقاکے ذریعہ یہ بیان کرتے ہوئے تشریح کی جاسکتی ہے کہ ہر چیز کا آغاز نام نہاد بنیادی ابتدائی مرحلہ سے ہوکر اپنے کمال کی طرف روبہ ترقی رہا۔

اس غلط نظریے کا مختلف میدانوں میں اعادہ ہوتا رہا۔مثال کے طور پر مارکسزم نے اس ترقی کے قطعی ہونے کا یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہر کسی کو آخر کار کمیونزم اختیار کر لینا ہوگا، لیکن تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ محض ایک خواب وخیال تھا اور مارکسزم کے دعوے کسی حقیقت کے عکاس نہیں تھے۔

نفسیات کے میدان میں سگمنڈ فریوڈ (**Sigmund Freud**) نے کہا کہ انسان ایک انتہائی ارتقا کردہ جنس ہے لیکن نفسیاتی طور پر اس کے افعال اب تک اپنے نام نہاد فرسودہ

آباؤاجداد کی مانند محرکوں سے تحریک کیے جاتے ہیں۔اس اہم غلطی کی تردید سائنسی طور پر نفسیاتی تحقیق کے ذریعہ کی گئی جو یہ دکھاتی ہے کہ فریوڈیانزم کے بنیادی خیالات کی کوئی سائنسی حقیقت نہیں ہے۔

اسی طرح معاشیات، بشریات، اور تاریخ کے میدان بھی ارتقا کے اس نظریے سے متاثر ہوئے ہیں لیکن آخری صدی کی دریافتوں سے حاصل کردہ معلومات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ یہ عمل غیر نتیجہ خیز ہے۔ان تمام ارتقائی نظریوں کا ایک قدر مشترک خاصہ ایمان باللہ کے خلاف ہے۔یہ دین کے ارتقا والے غلط نظریے کے پس پردہ ایک فلسفیانہ سوچ ہے۔ اس غلط نظریے کے ایک مشہور حامی ہربرٹ اسپنسر(Herbert Spencer) کے جھوٹے دعوؤں کے مطابق قدیم انسانوں کا کوئی دین نہیں تھا۔ پہلے ادیان فرضی طور پر مردوں کی عبادت سے شروع ہوئے۔ دوسرے ماہر بشریات جو دین کے ''ارتقا'' والے فریب کی تائید کرتے ہیں وہ اس سلسلہ میں مختلف توجیہات تجویز کرتے ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ دین کا سرچشمہ اینی میزم (Animism) یعنی مذہب الحیویۃ، الارواحیۃ ہے۔دوسروں کا خیال ہے کہ یہ ٹوٹی میزم (Totemism) یعنی اوثان پرستیسے ابھر کر آیا۔ایک دوسرا ماہر بشریات ای، بی، ٹائیلر(E. B. Taylor) کا عقیدہ ہے کہ دین اینی میزم سے مینی میزم (عبادت اسلاف) اور شرک' بالآخر توحید پر منتہی ہوا ہے۔

یہ نظریہ ایک ملحد ماہر بشریات نے انیسویں صدی میں پیش کیا اور اس وقت سے اب تک اس کو زندہ رکھا گیا ہے اور مختلف منظر ناموں میں پیش بھی کیا گیا ہے لیکن یہ حقیقت سے کوسوں دور ہے۔جیسا کہ آثار قدیمہ اور تاریخ کے شواہد ان سائنس دانوں کے تجویز کردہ نظریات کے برعکس دکھاتے ہیں کہ ابتدائی ادوار سے ایک توحید والا دین رہ چکا ہے کہ جس کو خدا نے انسانیت کی ہدایت کے لیے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ نازل فرمایا، لیکن سچے دین کے ساتھ ساتھ منحرف اور وہم پرستانہ عقائد برقرار رہے۔جس طرح کہ آج وہ لوگ بھی موجود ہیں جو ایک خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں، اور اس کے نازل کردہ دین کے مطابق زندگیاں بسر کرتے ہیں، اور دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو لکڑیوں، پتھروں کے

بنائے گئے بتوں، شیاطین ، اپنے آباؤاجداد ، مختلف روحوں، جانوروں، چاند، سورج اور ستاروں کی گمراہانہ طور پر عبادت کرتے ہیں۔ اور ان میں سے بہت سے لوگ پس ماندہ نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس انتہائی پیش رفتہ حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

تاریخ میں ایسے لوگ بھی رہ چکے ہیں جو اللہ کے نازل کردہ حقیقی دین کی نصیحتوں پر عمل پیرا نہیں ہوئے اور جنھوں نے اپنے اخلاقی اقدار کو نظرانداز کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ قرآن کچھ ایسے لوگوں کی نشان دہی کرتا ہے جو اپنی طرف نازل کیے گئے سچے دین میں اوہام پرستانہ عقائد اور اعمال کو اتارنا چاہتے تھے، اور اس دین میں فساد اور اختلاف ڈالنے کے درپے تھے :

> تو خرابی ہے ان کے لیے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے ان کے لیے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ان کے لیے اس کمائی سے۔ (سورۂ بقرہ؛ ۲/۷۹)

یہی وجہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اللہ کی وحدانیت اور اس کے وجود پر ایمان و یقین رکھنے اور اس کے احکام کو ماننے والے لوگوں نے حقیقی دین کو پس پشت ڈال کر گمراہانہ عقائد و اعمال اپنا لیے۔ بالفاظِ دیگر بعضوں کی تجویز کے خلاف دین کی ارتقا کے مراحل سے کبھی نہیں گزرا ہے بلکہ حقیقی دین بعض ادوار میں توڑ مروڑ دیا گیا اور نتیجتاً گمراہانہ عقائد سامنے آئے۔

حقیقی دین کا بگاڑ
Distortion of the True Religion

بیسویں صدی میں ادیان کے سرچشمے پر کی گئی اہم تحقیق دکھاتی ہے کہ دین کے ارتقا کے بارے میں دعووں کی کوئی سائنسی اہمیت نہیں ہے نیز یہ کہ اس طرح کے دعوے محض خیالی منظرنامے ہیں۔ اندریو لنگ (Andrew Lang) اور ولیم شمط (Wilhelm Schmidt) جیسے معروف ماہر بشریات کی ادیان عالم پر تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ ادیان کی کوئی ارتقا نہیں ہوئی اس کے برعکس بعض اوقات وقت کے ساتھ وہ تحریف کے شکار

ضرور ہوئے ہیں، شمط کی تحقیق کے نتائج انتھروپوس (Anthropos) نامی سلسلہ وار رسالہ میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

انیس سو سے لے کر انیس سو پینتیس تک کے دورانیہ میں بالخصوص کی گئی تحقیق دکھاتی ہے کہ ارتقاے ادیان کی بابت کیے گئے دعوے مکمل طور پر جھوٹے ہیں جس نے بہت سے ماہرین بشریات کو اپنے ارتقائی نظریات ترک کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن ان تمام سائنسی اور تاریخی حقائق کے باوجود بعض بنیاد پرست ملحدین نے اس غیر مستحکم منظرنامے کی حمایت کو برقرار رکھا ہے۔

مصر اور مابین النہرین میں آثارِ قدیمہ کی دریافتیں

Archaeological Finds from Egypt and Mesopotamia

''تہذیبوں کی پرورش گاہ'' کے طور پر مشہور مابین النہرین کی وادی قدیم مصر کی تہذیبوں سے دور نہیں ہے۔ ان معاشروں کے مذہبی عقائد کے بارے میں اہم معلومات ان علاقوں میں کی گئی اثریاتی تحقیق کی دریافتوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ ان کے چھوڑے ہوئے کتبے ان بے شمار جھوٹے خداؤں کی فعالیت کے بارے میں بتاتے ہیں جوں جوں معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور محققین ان دریافتوں کی تاویل کے بہترین طریقے معلوم کرتے گئے تو ان تہذیبوں کی مذہبی عقائد کے بارے میں تفصیلات ابھرنا شروع ہو گئیں۔ ایک انتہائی دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام جھوٹے خداؤں سے بالاتر وہ اللہ پر بھی عقیدہ رکھتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ سچے دین ہمیشہ سے بساطِ عالم کی زینت رہے رہے ہیں۔ اگلے صفحات میں مابین النہرین کے باسیوں، اہل مصر، اہل ہند اور اہل یورپ کی تہذیبوں کے ساتھ آزٹک (Aztecs), انکا (Incas) اور الما یا قوموں کی تاریخ ثابت کرتی ہیں کہ وہ سبھی ایک خدا پر یقین رکھتے تھے اور ان کے پاس پیغمبر آئے، جنھوں نے ان تک صحیح دین کا پیغام پہنچایا۔

شرک کے اندر توحید کی آمیزش کی دریافت کرنے والا آکسفورڈ یونیورسٹی کا پہلا محقق

اسٹیفن لینگ ڈان (Stephen Langdon) تھا جس نے ۱۹۳۱ء میں سائنسی دنیا کے سامنے اپنی دریافتوں کا اعلان کیا جو سابقہ ارتقاوالی تعبیرات کے انتہائی غیر متوقع اور مکمل طور پر برعکس ہیں۔ لینگ ڈان ان دریافتوں کو درج ذیل انداز میں پیش کرتا ہے :

۔۔۔انسان کی قدیم ترین تہذیب کی تاریخ توحید سے شرکِ محض اور بدروحوں پر دوررس عقیدہ کی طرف تیزی سے انحطاط پذیر ہوگئی ہے۔ ۴۳

پانچ سال بعد لینگ ڈان نے The Scotsman میں اس طرح بیان دیا :

یہ شہادت پوری صحت کے ساتھ توحید خالص کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قدیم ترین سامی لوگوں کی کندہ کاریاں اور تحریری باقیات توحید کو دکھاتے ہیں۔۔اور عبرانی اوردوسرے سامی ادیان کے اوثان پرستانہ سرچشمہ کو اب بالکل قدرو قیمت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ ۴۴

تین ہزار سال قبل مسیح کی تاریخ والی سومری شہر کا جائے وقوع جدید تل اسمار (Tell Asmar) میں کھدائیوں سے دریافتیں دستیاب ہوئی ہیں جو لینگ ڈان کے نظریات کی مکمل تصدیق کرتی ہیں۔ کھدائی کے مدیر ہنری فرنک فرٹ (Henry Frankfort) پورٹ نے یہ سرکاری بیان دیا :

ان کے مزید ٹھوس نتائج کے علاوہ ہماری کھدائیوں نے ایک عجیب حقیقت کو واشگاف کیا ہے، جسے بابل ادیان کے مطالعہ کنندگان کو آگے چل کر زیرِ تحقیق رکھنا ہوگا۔ ہم نے پہلی دفعہ اپنی بہترین معلومات کے مطابق معاشی ڈھانچے کے لحاظ سے مکمل مذہبی مواد حاصل کیے ہیں۔

ہمارے پاس باہم مربوط شواہد موجود ہیں جو ان عبادت خانوں اور اہل عبادت کے مخصوص گھروں سے تقریباً یکساں انداز میں حاصل کیے گئے ہیں، اس وجہ سے ہم ان نتائج کو اخذ کرنے کے قابل ہیں جن کا حصول محض ان دریافتوں کے مطالعہ سے ممکن نہ تھا۔ مثال کے طور پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر مختلف دیوتاؤں سے مربوط سلنڈر رنما مہروں کے نمونے ایک مستقل تصویر میں فٹ کیے

جا سکتے ہیں جس کے اندر اس عبادت خانے میں ایک خدا کو بطورِ معبود مرکزی ہستی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کے اندر سومیر وا کا دیان کے عقیدہ میں اس کی مختلف صفات کو مختلف دیوتاؤں کے طور پر تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ ۷۵

فرنک فرٹ کی دریافتیں بہت اہم حقائق کا انکشاف کرتی ہیں کہ کس طرح ایک اوہام پرستانہ اور مشرکانہ نظام وجود میں آیا۔ نظریہ ارتقاے ادیان کا دعویٰ ہے کہ شرک اس وقت ابھر کر آیا جب لوگوں نے فطرت کی قوتوں کی نمائندگی کرنے والی بدروحوں کی عبادت کرنا شروع کردی۔ وقت کے ساتھ لوگ ایک خدا کی مختلف صفات کو جداگانہ انداز میں سمجھنے لگے جس نے انجام کار ایک خدا کے عقیدے کی تحریف کردی۔ اور اس طرح ایک خدا کی مختلف صفات گوناگوں خداؤں پر عقیدے میں بدل گئیں۔

لینگ ڈان کے ترجمہ کردہ سومری قوم کے سنگی کتبوں سے بہت پہلے فریڈرکھ ڈیلیش (Friedrich Delitzsch) نامی محقق نے اس سے ملتی جلتی دریافتیں کرتے ہوئے معلوم کیا کہ بابل والے گروہ کے مختلف دیوتا مردوک کی مختلف صفات سے ابھر کر آئے ہیں۔ اس وقت کا ایک خدا اس نام سے پکارا جاتا تھا۔ تحقیق نے دکھایا ہے کہ وقت کے ساتھ مردوک پر عقیدہ ایک سچے خدا پر عقیدہ کے فساد کے نتیجے میں سامنے آیا۔

اس ایک خدا مردوک کے مختلف نام تھے، وہ نینب ''قوت کا مالک''، نرگل ''مالک جنگ''، بیل ''شہنشاہ''، نیبا ''پیغمبر کا مالک''، سن ''رات کو منور کرنے والا''، شمش ''ہر حق کا مالک'' اور اڈّو ''خداے باراں'' کے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مردوک کی صفات اس سے جدا ہو کر مختلف دیوتاؤں کے حوالے کردی گئیں ، اور جھوٹے خدا یعنی خداے آفتاب اور خدائے ماہتاب نے لوگوں کے عقیدوں پر اپنا تسلط جمالیا۔ ان جھوٹے خدا کے مختلف ناموں کے ساتھ مردوک پر عقیدہ یہ دکھاتا ہے کہ اس طرح کے عقائد دراصل خدائے واحد کے عقیدہ کی تحریف سے پیدا ہوئے۔

قدیم مصر میں بھی اسی قسم کے بگاڑ کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ محققین نے

دریافت کیا ہے کہ قدیم اہل مصر پہلے موحد تھے، لیکن بعد میں انھوں نے اس نظام کا شیرازہ بکھیر کر اسے آفتاب پرستی میں بدل دیا۔ ایم۔ڈی روگ(M.de Rouge) لکھتا ہے :

یہ بلا اختلاف صحیح ہے کہ مصری دین کے اعلیٰ حصے، ترقی کے عمل یا اس کے بڑے حصے کی نظر اندازی کا نسبتاً زود آمدہ نتیجہ نہیں کہے جا سکتے۔ اعلیٰ حصے یقیناً قدیم ہیں، اور یونانی اور لاطینی غیر اہل کتاب یا عیسائی مصنفوں کو معلوم مصری دین کا آخری مرحلہ مکمل طور پر کچھ زیادہ ہی بگڑا ہوا تھا۔۷۶

ماہر بشریات سر فلنڈرز پیٹری(Sir Flinders Petrie) کہتا ہے کہ اوہام پرستانہ اور مشرکانہ عقائد ایک خدا کے عقیدہ کی آہستہ آہستہ بگاڑ سے ابھر کر آئے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ کہتا ہے کہ بگاڑ کا یہ سلسلہ آج کے معاشروں اور گزشتہ معاشروں میں یکساں دیکھا جا سکتا ہے :

قدیم مذاہب اور دینیات میں مختلف درجات کے خدا موجود ہیں، بعض نسلیں جیسا کہ جدید ہندو، چھوٹے بڑے خداؤں کی کثرت کی رنگ رلیاں مناتے ہیں جو مسلسل بڑھتے رہتے ہیں دوسرے ۔۔۔۔ بڑے خداؤں کی عبادت کی کوشش نہیں کرتے بلکہ مخصوص روحوں اور بدروحوں کی میزبانی کا فریضہ سرانجام دیتے رہتے ہیں۔۔۔۔

ایک خدا کا نظریہ اگر ایک روح کی عبادت سے ارتقا کر کے آتا تو ہم ایک خدا کی عبادت سے پہلے بہت سے خداؤں کی عبادت کو پا لیتے ۔۔۔۔ لیکن دستیاب معلومات اس کے برعکس ہیں ۔ اور وہ یہ کہ دینیات کی تفتیش میں سب سے پہلا مرحلہ توحید کا آتا ہے۔۔۔۔

جب کبھی ہم شرک کو اس کے ابتدائی مراحل میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ توحید کی آمیزشوں سے وجود پذیر ہوا ہے۔۔۔۔۷۷

ہندوستان اوہام پرستانہ عقائد کا سرچشمہ
The Origins of Superstitious Polytheism in India

اگر چہ ہندی ثقافت مشرق وسطیٰ کی ثقافتوں سے زیادہ قدیم نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ دنیا کی قدیم ترین ثقافتوں میں سے باقی رہ جانے والی ایک ہے۔ کفر ہندی میں نام نہاد خداؤں کی تعداد بے شمار ہے۔ گہرے مطالعہ کے بعد اندریو لینگ نے اس بات کو واشگاف کیا ہے کہ مشرق وسطیٰ کی مانند اپنائے گئے طریقہ کار کے نتیجے میں ہندوستان میں یہ مشرکانہ ادیان نمودار ہوئے۔

ایڈورٹ مک کریڈی **(Edward McCrady)** ہندوستان کے مذہبی عقائد کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> رگوویددکھاتی ہے کہ ابتدائی دنوں میں یہ مختلف خدا ایک ہی خدا کے جداگانہ مظاہر تصور کیے جاتے تھے۔۷۸

رگوویدکے ورد میں ہم کو ایک ہی خدا کے توحید پرستانہ نظریے کے بگاڑ کے آثار نظر آسکتے ہیں۔ اس میدان کے ایک دوسرے محقق میکس میولر **(Max Muller)** اس بات پر متفق ہے کہ پہلے پہل لوگ صرف ایک خدا پر عقیدہ رکھتے تھے:

> وید کے شرک سے پہلے ایک اور لامحدود خدا کی یاد میں نیز بہت سے خداؤں کی دعاؤں میں بھی توحید موجود ہے۔ یہ اس بت پرستانہ جملے کی دھند کو ایسے ہی ختم کر دیتا ہے جیسے گزرتے ہوئے بادلوں نے نیلے آسمان کو اپنے اندر چھپا رکھا تھا۔۷۹

اس سے ایک بار پھر یہ واضح ہوا کہ ادیان کی کوئی ارتقا نہیں ہوئی بلکہ لوگوں نے سچے دین کے ساتھ اور جھوٹے عناصر ضم کر دیے ہیں یا بعض اوامر ونواہی کو نظر کر دیا ہے جو انجام کار دینی عقیدے کے بگاڑ کا سبب بنا۔

یوروپی تاریخ میں ادیان کا بگاڑ
Contamination of Religions in European History

یوروپی معاشروں کے عقائد میں بھی اس طرح کے بگاڑ کی نشانیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ قدیم یونانی کفر کا ایک محقق ایکسل ڈبلیو۔ پرسن (Axel W.persson) اپنی کتاب **"The Religion of Greece in Prehistoric Times"** میں لکھتا ہے:

> ۔۔۔کم وبیش اہمیت والے اشخاص کی ایک بڑی تعداد بعد میں ابھر کر آئی جن سے یونانی مذہبی قصوں میں ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ میرے خیال میں بہت حد تک ان کی اکثریت کا انحصار محض ایک ہی خدا کے مختلف دعائیہ ناموں پر ہے۔ ۸۰

اس دینی تحریف کے اثرات اٹلی میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایرینے روسنزویگ **(Irene Rosenzweig)** نامی ایک ماہرآثار قدیمہاٹروسکین کے دور کے ایگوون **(Iguvine)** کتبے کی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے :

> مختلف دیوتاؤں کا امتیاز محض ان کے اسم صفت سے ہوتا ہے، جو آگے چل کر ایک خودمختار ربانی قوت پر منتج ہوتے ہیں۔ ۸۱

مختصر یہ کہ گزشتہ صدی کے ماہرین بشریات اور آثار قدیمہ کے دلائل بتاتے ہیں کہ پوری تاریخ میں معاشرے پہلے ایک خدا پر ایمان رکھتے تھے لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اس عقیدے کو بھی تبدیل کر دیا۔ سب سے پہلے لوگ اس خدا پر یقین رکھتے تھے جس نے ہر شے کو نیستی وجود میں لایا جو علیم وبصیر اور رب العالمین ہے۔ لیکن بعض ادوار میں ہمارے رب کی صفات کے خطابات کو غلط طور پر مختلف خداؤں کی حیثیت سے تصور کیا گیا اور لوگوں نے ان باطل خداؤں کی عبادت شروع کر دی، صحیح دین صرف ایک ہی خدا کی عبادت کا نام ہے، جس کو اللہ تعالیٰ عالم انسانیت کے لیے حضرت آدم-علیہ السلام- کے وقت سے نازل کرتا رہا اور مشرکانہ دین کا آغاز اس صحیح دین کی آلودگی سے ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ صحیح دین

The True Religion Revealed by God

جب ہم دنیا کے مختلف علاقوں میں موجود معاشروں کے ثقافتی اور مذہبی اقدار پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ آپس میں بہت حد تک مشترک ہیں۔ ان معاشروں نے آپس میں ثقافتی تبادلہ تو نہیں کیا ہوگا تاہم وہ فرشتوں، شیطان اور جن جیسے مخلوقات پر عقیدہ رکھتے تھے جو انسانوں کی طرح اسی ماحول میں زندگی بسر نہیں کرتے۔ وہ بعث بعد الموت اور مٹی سے انسان کے جنم پر یقین رکھتے تھے، اور ان کی عبادت میں بہت سے عناصر مشترک ہیں مثال کے طور پر کشتی نوح کا ذکر سومری تاریخی دستاویز میں بھی ہیں، ویلش مذہب میں بھی ہیں اور چین کے کتبوں میں بھی، نیز قدیم لیتھوانی مذہب میں بھی۔

یہ محض ایک اور ثبوت ہے کہ مالک ومختار اور رب العالمین الہ واحد -عزوجل- نے مذہبی اخلاقی اصول نازل فرمائے۔ پوری دنیا میں اعلیٰ مقام رکھنے والے ادیان نے ثقافتوں کی بنیاد ڈالی ہے جو ایک خداے بے ہمتا کے وجود کو ظاہر کرتی ہے۔

ہمارے رب نے اپنے برگزیدہ اور عظیم الشان بندوں کے وسیلے سے تاریخ کے ہر دور میں اپنی الوہیت کے جلوے بے نقاب فرمائے ہیں۔ اور ان کے وسیلے سے اس نے انسانوں کے لیے چنندہ دین کو آشکار فرمایا ہے۔ اللہ -عزوجل- اپنی آخری نازل کردہ کتاب مقدس قرآن میں اعلان فرماتا ہے :

اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے۔ (سورۂ؛ ۱۳/ ۷)

دوسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ تمام لوگوں کو ڈرانے کی خاطر پیغمبر بھیجتا ہے۔

اور ہم نے کوئی بستی ہلاک نہ کی جسے ڈر سنانے والے نہ ہوں، نصیحت کے لیے، اور ہم ظلم نہیں کرتے۔ (سورۂ شوری؛ ۲۶/ ۲۰۷، ۲۰۸)

ان برگزیدہ پیغمبروں نے ہمیشہ لوگوں کو یہی سکھایا ہے کہ ان کو بحیثیت الٰہ ایک ہی خدا

پر یقین رکھنا چاہیے، صرف اسی کی بندگی کرنی چاہیے، اور نیکی پر عمل اور گناہوں سے کنارہ کشی کرنی چاہیے۔

بارگاہِ الٰہی کے برگزیدہ اور جلیل القدر ان پیغمبروں کی اطاعت اور میراث کے طور پر چھوڑی ہوئی ان کی کتابوں کی اطاعت سے انسانیت کو نجات حاصل ہوگی۔ ہمارے رب کے بھیجے ہوئے آخری پیغمبر حضور رحمت للعالمین جناب محمد رسول اللہ- صلی اللہ علیہ وسلم- ہیں۔ اور خدا کی دائمی حفاظت میں لی گئی آخری ربانی کتاب قرآن ہے، جو انسانیت کے لیے بہترین راہ نما ہے۔

خلاصہ بحث

وقت کی فنائیت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے

CONCLUSION

The Reality of Timelessness Should Not Be Ignored

اس کتاب میں تاریخ اور آثار قدیمہ کی جن دریافتوں کا ہم نے معاینہ کیا ہے وہ دکھاتے ہیں کہ تاریخ اور معاشروں کے بارے میں ڈارون کے ارتقائی دعوے غیر سائنسی اور بالکل بے سروپا ہیں۔ اور ان کو برقرار رکھنے کا واحد سبب مادیت کے زوال کے بارے میں ان کی تشویش ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حقیقت تخلیق کی تردید کرتے ہوئے مادہ پرست یہ غلط عقیدہ رکھتے ہیں کہ مادہ ایک مطلق وجود ہے جو ہمیشہ سے موجود رہا ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ بالفاظ دیگر انھوں نے مادے کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے (لیکن خدا در حقیقت اس سے بالاتر کسی اور ہستی کا نام ہے) تاہم آج سائنس اس نقطے کی تصدیق پر پہنچ گئی ہے کہ کائنات عدم سے وجود میں آئی ہے (یعنی پیدا کی گئی ہے) جس نے مادیت اور مادہ پرستانہ نظریات کی تائید کرنے والے ان تمام نظریات اور فلسفوں کو باطل قرار دیا ہے۔

تاہم اگرچہ مادہ پرستوں کے نظریات سائنسی شہادتوں کی ضد ہیں، وہ کسی قیمت پر یہ قبول نہیں کر سکتے کہ مادہ لازوال نہیں بلکہ مخلوق ہے اگر وہ اپنے متعصّبانہ عقیدے کی عینک تھوڑی دیر کے لیے اتار دیں تو وہ اس سادہ حقیقت کو دیکھنے کے قابل بن جائیں گے اور اس مادہ پرستی کے جادو سے خود کو نجات دلا سکیں گے۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے انھیں اپنے اپنائے ہوئے نظریات کو ایک طرف رکھنا، خود کو نظریاتی تعصب سے دست بردار کرنا اور کھلی ذہنیت کے ساتھ سوچنا ہوگا۔

ایک چیز جو اُن کے لیے بہر حال غور طلب ہے وہ تصورِ وقت کی اصل فطرت ہے ، کیوں کہ مادہ پرست سوچتے ہیں کہ مادہ کی طرح وقت بھی حقیقت مطلقہ ہے، اس جھانسے نے ان میں سے بہتیروں کو حقیقت کا چہرہ دیکھنے سے روک رکھا ہے۔ جدید سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ وقت مادے سے مشتق ہے ، اور خود مادے کی طرح وقت بھی نیستی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت کا ایک آغاز تھا۔ گزشتہ صدی میں یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ وقت ایک اضافی تصور ہے یعنی یہ ایک قسم کا تغیر پذیر شعور ہے۔ اور کوئی پائیدار اور غیر تغیر پذیر شے نہیں ہے جیسا کہ صدیوں سے مادہ پرست باور کرتے چلے آرہے ہیں۔

وقت کے تصور کی اصل فطرت

The Real Nature of the Concept of Time

جس چیز کو ہم ''وقت'' کے نام سے جانتے ہیں درحقیقت وہ ایک طریقہ کار ہے جس کے ذریعہ ہم ایک واقعہ کا دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب کوئی بندہ ایک چیز پر دستک دیتا ہے تو وہ ایک خاص آواز سنتا ہے اگر وہ اسی چیز کو دوبارہ دستک دے تو وہ ایک دوسری قسم کی آواز سنتا ہے ، اور اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان دو آوازوں کے درمیان ایک وقفہ ہے وہ اس وقفے کو ''وقت'' کے نام سے جانتا ہے۔ مگر جب وہ دوسری آواز سنتا ہے تو اس کی سنی ہوئی پہلی آواز اس کے دماغ میں ایک تصور سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی جو اس کی

یادداشت میں ایک معمولی سے واقعہ کی حیثیت سے ہوتی ہے۔وقت کے شعور کے لیے ایک شخص ''موجودہ'' لمحے کا اپنے ذہن میں موجود تصور کے ساتھ موازنہ کرتا ہے۔اگر وہ یہ موازنہ نہ کرے تو وہ کبھی بھی وقت کا ادراک نہیں کرسکتا۔مشہور ماہر طبعیات جولین باربور (Julian Barbour)وقت کی تعریف اس طرح کرتا ہے :

وقت، اشیا کی بدلتی ہوئی حالتوں کی پیمائش کے علاوہ اور کچھ نہیں۔رقاصہ جھولتی ہے اور گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی ہیں۔ ۸۲

مختصر یہ کہ وقت ذہن میں ذخیر کی ہوئی معلومات کے نتیجہ کے طور پر ابھر کر آتا ہے۔ اگر انسان کی قوت حافظہ نہ ہو تو اس کا ذہن اس طرح کی تعبیرات نہیں کرسکتا۔اور نہ اس طرح وقت کا شعور وادراک کرسکتا۔ایک بندہ خود کو تیس سالہ ایسی حال میں تصور کرتا ہے جب وہ تیس سالوں سے متعلق معلومات کو ذہن میں جمع کیے ہوئے ہو۔اگر اس کی یادداشت موجود نہیں ہے تو وہ اپنے پچھلے دور کے بارے میں کچھ سوچ نہیں سکتا۔صرف اپنے اس موجودہ ''لمحے'' کا ادراک کرسکتا ہے جس میں وہ زندگی بسر کررہا ہے۔

تصورِ'ماضی'محض ہماری یادداشت پر مبنی ہے

Our Concept of the "Past" Is Merely Information in Our Memories

اپنے حاصل کردہ محرکات کی بنیاد پر ہم وقت کی مختلف تقسیمات یعنی ماضی حال مستقبل میں زندگی گزارنے کا تصور کرتے ہیں (جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں) تاہم 'ماضی' کے تصور کا سبب صرف یہ ہوتا ہے کہ مختلف واقعات ہماری یادداشت میں محفوظ کردیے گئے ہیں ۔مثال کے طور پر ہم اس لمحے کو یاد کرتے ہیں جب ہمیں پرائمری اسکول میں داخل کردیا گیا اور اس طرح ہم اس کو ماضی کے ایک واقعہ کے طور پر جانتے ہیں تاہم مستقبل کے واقعات ہماری یادداشت میں اس لیے نہیں ہوتے کہ ہم مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کو نہیں

جانتے جن کا ہمیں مستقبل میں سامنا کرنا ہے۔ اپنے نقطہ نظر سے ہم نے ماضی کے واقعات کا تجربہ کرلیا ہے تو بالکل یہی حال مستقبل کا بھی ہے۔ مگر چوں کہ یہ واقعات ہماری یادداشت تک پہنچائے نہیں گئے ہیں اس لیے ہم ان کے حتمی علم سے نا آشنا ہیں۔

اگر خدا ہماری یادداشت میں مستقبل کے واقعات ڈال دیتا تو مستقبل ہمارے لیے ماضی بن جاتا۔ مثال کے طور پر ایک تیس سالہ شخص ان تیس سال کی یادداشت اور واقعات کو یاد کرتا ہے اور اپنے ماضی کو تیس سال پر محیط تصور کرتا ہے۔ اگر اس شخص کی یادداشت میں تیس اور ستر سالوں کے درمیان مستقبل کے واقعات کو ڈال دیا جائے تو پھر اس تیس سالہ شخص کے لیے اپنی گزشتہ تیس سالہ زندگی اور مستقبل کا تیس سے لے کر ستر سال کے درمیان کا زمانہ ماضی بن جائے گا۔ ان حالات میں ماضی اور مستقبل دونوں اس کی یادداشت میں موجود ہوں گے اور ہر ایک اس کے لیے کھلے تجربے ثابت ہوں گے۔

کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خاص سلسلوں میں واقعات کے شعور ہمیں عنایت فرمائے ہیں جیسا کہ وقت ماضی سے مستقبل کی طرف روبحرکت ہے۔ اس لیے وہ ہمیں مستقبل کے بارے میں آگاہ نہیں کرتا یا ہماری یادداشت میں ان معلومات کو نہیں ڈالتا تو گویا ہماری یاد داشت میں مستقبل نہیں ہے لیکن انسانوں کے ماضی اور مستقبل کے تمام احوال اس کے علم ازلی میں ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے اس مشاہدے کی طرح ہے جو مجموعی طور پر ایک فلم کی شکل میں مکمل اور رونما ہوئے ہوں۔ اگر کوئی اس فلم کو آگے نہیں بڑھا سکتا تو وہ اپنی زندگی کو ایک ایک کر کے گزرتے ہوئے لمحات کے طور پر دیکھتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی اس سوچ میں بظاہر غلطی پر ہے کہ ان دیکھے لمحات کو مستقبل پر منطبق کرتا ہے۔

تاریخ عالم بھی ایک اضافی تصور ہے
World History Is Also a Relative Concept

یہ تمام حقائق، تاریخ اور معاشرتی زندگی پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ ہم معاشروں اور

دنیاوی تاریخ کو وقت اور مدت کے تصور کے درمیان محدود سمجھتے ہیں۔ہم تاریخ کو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں ،اور اپنے اس اضافی تصور کے نقطہ نظر سے اس پر غور کرتے ہیں ۔اپنی بقا کے لیے حواس خمسہ پر انحصار کرتے ہیں اور صرف اسی چیز کا ادراک کرتے ہیں جس کا ہمارے حواس ہمیں اجازت دیتے ہیں۔اور ہم اپنے حواس کے حدود کو پار کرنے کے مجاز نہیں ہوسکتے۔وقت اور مدت کے جن حدود میں ہم رہ رہے ہیں وہ بھی ہمارا احساس ہی ہے۔ اگر ہمارا ذہن اپنے حواس خمسہ سے کسی چیز کا سراغ نہ لگا سکے تو ہم مختصر الفاظ میں کہتے ہیں کہ وہ ہستی ''غائب'' ہوگئی ہے۔

اسی طرح واقعات اور تصورات یا احساسات جو ہماری یادداشتوں میں محفوظ ہیں وہ ہمارے لیے موجود یعنی زندہ ہوتے ہیں لیکن فراموش کردہ اشیا کا مزید کوئی وجود نہیں۔بالفاظِ دیگر یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ جو مخلوقات اور واقعات ہماری یادداشت میں نہیں ہیں وہ ہمارے لیے ماضی کے واقعات بن جاتے ہیں اور وہ محض ''مردہ'' اور ناپید ہوتے ہیں۔تاہم یہ بات صرف انسانوں کے بارے میں درست ہے کیوں کہ مجموعی طور پر انسانوں کی یادداشت محدود ہوتی ہے۔جب کہ علم الٰہی ہر چیز سے بالاتر، لامحدود اور دائمی ہے۔

مگر یہاں ایک نقطہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔''خدا کی یادداشت'' کی اصطلاح محض وضاحت کی خاطر استعمال کی گئی ہے۔یہ بالکل ہی ناممکن ہے کہ انسانی یادداشت اور خدا کی یادداشت کے درمیان مشابہت ومماثلت کا کوئی تصور کیا جاسکے۔خدا یقیناً واحد ہے جو ہر شے کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور ہر چیز کا اس کی جملہ کنہ کے ساتھ اسے علم ہے۔

چوں کہ خدا کی یادداشت لامحدود ہے تو اس میں سے کوئی چیز کبھی گم نہیں ہوسکتی بالفاظ دیگر اللہ کی پیدا کردہ کوئی مخلوق کبھی غائب نہیں ہوتی۔کوئی بھی پھول پژمردہ نہیں ہوتا، پانی کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے ،کوئی دور اپنی انتہا کو نہیں پہنچتا اور اشیائے خوردنی کبھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوتیں۔یہ کائنات غبار والے بادل کی حیثیت سے اپنی پہلی صورت میں خدا کی نظر میں ہے۔تاریخ کا ہر واقعہ اس کی نظر میں جیسا تھا ویسا ہی آج موجود ہے۔

اسٹون ہنج (Stonehenge) کے پتھر اپنی جگہوں پر رکھے جاتے ہیں، مصر کے

اہرام تعمیر کیے جاتے ہیں، سومری قوم ستاروں کا مشاہدہ کرتی ہے،نیدر تال (Neanderdhals) اپنی زندگی کے بچے کھچے ایام گن رہے ہیں ۔ لاس کاکس (Lascaux) غاروں والی تصاویر کھینچی جاتی ہیں۔لوگ کیٹل ہیوک (Catal Huyuk) میں رہتے ہیں اور دوسری جنگ عظیم زوروں پر ہے۔

اسی طرح معاشرے جو اگلے ہزاروں سالوں میں زندگی بسر کریں گے ابھی سے خدا کی نظر میں موجود ہیں، جیسے کہ وہ اپنی تہذیبوں کی تعمیر کر رہے ہیں اور اپنی زندگیوں کو ترتیب دے رہے ہیں۔ایک مخلوق یا ایک واقعہ کے لیے اس وقت سے ابدیت شروع ہوتی ہے جس وقت سے اس کو پیدا کیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر جب ایک پھول کو پیدا کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب اسے غائب نہیں ہونا ہے۔اگر یہ کسی کے حواس کا حصہ ہٹ جاتا ہے،اور کسی کے یادداشت سے محو کر دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ غائب ہو گیا ہے یا مر گیا ہے ۔ خدا کی نظر میں اس کی حالت درحقیقت وہی پہلے کی سی ہے ۔مزید برآں اسی مخلوق کے تمام حالات اپنی تخلیق سے لے کر اپنی زندگی یا موت کے تمام لمحات تک اللہ تعالیٰ کی یادداشت میں موجود ہیں۔

دیانت دارانہ لمحہ فکریہ
Honest Reflection

انسانی زندگی میں علوم ومعارف کی اہمیت مسلم ہے،اور یہ کسی قسم کا کوئی فلسفہ یا مکتبہ فکر نہیں ہے بلکہ نا قابل انکار سائنسی حقائق کا نتیجہ ہے۔غالباً بہت سے قارئین فنائیت اور اپنی زندگیوں میں پہلی دفعہ وقت کی اصل حقیقت کے بارے میں ان حقائق پر غور وخوض کرتے ہیں۔تاہم یہ حقیقت ذہن نشیں رہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں واضح فرماتا ہے :

سوجھ اور سمجھ ہر رجوع والے بندے کے لیے۔(سورۂ ق؛۵۰/۸)

بالفاظِ دیگر صرف سچائی کے جویا حضرات ہی ہدایت ربانی کی تلاش میں ہوتے ہیں اور اس کی لامحدود قوت اور عظمت کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ،وہ ان

توضیحات پر غور کریں گے اور ان حقائق کو مکمل طور پر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

ایک شخص اپنی پوری زندگی میں مادہ پرستی سے مرعوب رہتا ہے تو شاید اس کے زیر اثر اس کو کھلے ذہن کے ساتھ ان حقائق پر غور وخوض کرنے کا موقع میسر نہیں آیا ہوگا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی زندگی کو اسی غلط منہاج پر ہمیشہ برقرار رکھے۔ جس پر بھی آفتاب حقیقت طلوع ہوجائے اس کو غلطی کے اندھیروں میں پڑے رہنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اپنے ضمیر کی اخلاقی صدا کو سن کر اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر شخص ایسا بننے سے پرہیز جو اپنے ضمیر میں حقیقت کو دیکھ کر بھی اس سے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے :

> اور ان کے منکر ہوئے اور ان کے دلوں میں ان کا یقین تھا ظلم اور تکبر سے تو دیکھو کیسا انجام ہوا فسادیوں کا۔ (سورۂ نمل؛ ۲۷/ ۱۴)

جو لوگ حقیقت کو دیکھ کر اس کو تسلیم کر لیتے ہیں - ان شاء اللہ - وہ اس دنیا اور آخرت میں نجات وسلامتی پالیں گے۔

> اور وہ جو یہ سچ لے کر تشریف لائے اور وہ جنھوں نے ان کی تصدیق کی، یہی ڈر والے ہیں۔ (سورۂ زمر؛ ۳۹/ ۳۳)

تصاویر اور اشارے

484

وسط: دس ہزار قبل مسیح والے یہ اوزار سیاہ شیشے جیسی چٹان سے بنائے گئے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ سیاہ شیشے جیسے پتھر کو کسی دوسرے پتھر کے ساتھ رگڑ کر ایسے اوزار بنائے جاسکیں۔

بالا: یہ چمچے دکھاتے ہیں کہ اس وقت کے لوگ آداب دسترخوان سے واقف تھے۔ یہ اس بات کا ایک مزید ثبوت ہے کہ انھوں نے کبھی ایسی فرسودہ زندگی نہیں گزاری ہے جیسا کہ ارباب ارتقا دعوی کرتے ہیں۔

زیریں: چالیس ہزار سال پرانی بانسری اس بات کا ثبوت ہے کہ فرسودہ ذہن والے بندر نما انسانوں کا کبھی وجود نہیں رہا ہے۔ سائنسی تحقیق دکھاتی ہے کہ یہ قدیم بانسری' آج کی مغربی دنیا میں رواج پذیر ہفت سروں والی بانسری' سے دس ہزار سال قبل استعمال ہوا کرتی تھی۔

485

بالا: پتھر کی یہ کندہ کاری گیارہ ہزار سال پرانی ہے جب کہ ارباب ارتقا کے مطابق محض خام پتھر والے اوزار استعمال ہوا کرتے تھے۔ تاہم اس طرح کا فن پارہ محض ایک پتھر کو دوسرے پتھر کے ساتھ رگڑنے سے تشکیل نہیں دیا جاسکتا۔ ارباب ارتقا ان پر سلیقہ ابھرے ہوئے نقوش کی کوئی عقلی اور منطقی تعبیر پیش نہیں کرسکتے۔ لوہے اور اسٹیل کا استعمال کرنے والے ذہین انسانوں نے یہ اور اس طرح کے دوسرے فن پاروں کو وجود میں لایا ہے۔

زیریں: پانچ لاکھ پچاس ہزار سال پرانے پتھر کے اس دستی کلہاڑے کو کاٹنے اور سلیقہ سے بنانے کے لیے دوسرے لوہے یا اسٹیل جیسی نسبتاً سخت دھاتوں کا ضرور استعمال کیا گیا ہوگا۔

486

پتھر کا زمانہ کبھی نہیں رہا ہے۔جس دور کو ارباب ارتقا پتھر کا دور کہتے ہیں اس دور میں لوگ عبادتیں کیا کرتے تھے، وہ مبعوث پیغمبروں کے پیغامات سنا کرتے تھے، عمارتوں کی تعمیر کرتے تھے، باورچی خانوں میں کھانے تیار کرتے تھے، اپنے خاندان والوں کے ساتھ باتیں کرتے تھے، ہم سایوں کی ملاقات کے لیے جاتے تھے، کپڑوں کی سلائی کیا کرتے تھے، ڈاکٹر علاج معالجہ کیا کرتے تھے، موسیقی میں دلچسپی لیتے تھے، تصویر اور مجسمہ سازی کیا کرتے تھے، مختصر یہ کہ ایک عام انسانوں کی سی بھرپور زندگی گزارتے تھے۔جیسا کہ آثار قدیمہ کی دریافتیں دکھاتی ہیں وقت گزرنے کے ساتھ اکتساب علم اور ٹکنالوجی میں ترقیاں واقع ہوتی رہیں لیکن انسان ہمیشہ انسان ہی کی مانند رہا ہے۔

نیولیتھک کے اختتامی دور کے پتھروں اور سیپیوں کا یہ ہار بتاتا ہے کہ اس وقت کے لوگوں کے پاس نہ صرف ذوق اور فنی مہارت تھی بلکہ یہ بھی دکھاتا ہے کہ ان کے پاس ایسے مزین اشیا بنانے والی ٹکنالوجی بھی ضرور موجود تھی۔

مختلف برتن، ایک ماڈل میز اور چمچہ جو سات اور گیارہ ہزار سال قبل مسیح کے درمیانی دور کے ہیں اس وقت کے لوگوں کی معیاری زندگی کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ارباب ارتقا کے مطابق اس وقت کے لوگوں نے محض ایک اقامت پذیر زندگی اپنانا شروع کی تھی اور ابھی مہذب بننا سیکھ رہے تھے۔مگر یہ اشیا دکھاتی ہیں کہ ان لوگوں کی ثقافت کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں تھا اور وہ مکمل طور پر مہذب زندگیاں بسر کر رہے تھے۔جیسا کہ آج ہم کر رہے ہیں اس طرح وہ میزوں پر بیٹھتے، رکابیوں، چاقوؤں، چمچوں اور کانٹوں کا استعمال کر کے کھانے کھاتے، اپنے مہمانوں کی دل لگی کا سامان کرتے، اور ان کے ذوق کا ہر ممکن انتظام کرتے مختصر یہ کہ باقاعدہ زندگی گزارتے تھے۔ جب مجموعی طور پر ان دریافتوں کا معائنہ کیا جاتا ہے اور ان کی مہارتی سمجھ، طبی علم، فنی وسائل اور روزمرہ کی زندگیوں کو دیکھتے ہیں۔تو نیولیتھک والے لوگ خود سے پہلے اور بعد والے لوگوں کی طرح مکمل انسانوں کی سی زندگی گزارتے تھے۔

487

بارہ ہزار سال والے بٹن :

تقریباً دس ہزار سال قبل استعمال ہونے والے ہڈی کے یہ بٹن دکھاتے ہیں کہ اس وقت کے لوگ کپڑوں میں کنڈیاں استعمال کرتے تھے ۔بٹن کے استعمال پر مطلع معاشرہ سلائی، پارچہ بافی، اور بُنائی کا ہنر ضرور جانتا ہوگا۔

نو ہزار سال سے لے کر دس ہزار سال پرانی سوئیاں اور سووے :

تقریباً سات ہزار سال سے لے کر آٹھ ہزار سال پرانی یہ سوئیاں اور سوے اس دور کے لوگوں کی ثقافتی زندگیوں کا منہ بولتا ہیں کہ جو لوگ سوؤں اور سوئیوں کا استعمال کیا کرتے تھے تو بلاشبہہ وہ انسانوں کی طرح بھرپور زندگیاں بھی بسر کرتے تھے، نہ کہ جانوروں کی طرح۔ جیسا کہ ارباب ارتقا دعویٰ کرتے ہیں۔

بارہ ہزار سال پرانی موتیاں :

ماہرین آثارقدیمہ کے مطابق تقریباً دس ہزار سال پرانے یہ پتھر موتیوں کی طرح استعمال ہوتے تھے ۔ایسے سخت پتھروں میں مکمل طور پر باقاعدہ سوراخ بطورِ خاص قابل ذکر ہے۔ کیوں کہ اسٹیل یا لوہے کے بنے ہوئے اوزار ان میں سوراخ کرنے کے لیے ضرور استعمال ہوئے ہوں گے۔

بارہ ہزار سال قبل والا تانبے کا سوا :

تقریباً دس ہزار سال پرانا تانبے کا یہ سوا اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کو دھاتوں کا علم تھا اور ان کو معدنوں سے نکالا کرتے تھے، اور اس دور میں ان سے اوزار بنائے جاتے تھے ۔عام طور پر دانے دار یا پوڈر کی شکل میں پایا جانے والا خام تانبا پرانے اور سخت پتھروں کے اندر پرتوں کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔

ایک ایسا معاشرہ جس نے تانبے کا سوا بنایا ہو وہ خام تانبے سے ضرور آگاہ ہوگا۔ پتھروں کے درمیان سے اس کو نکالنے کا بندوبست کیا ہوگا، اور اس کو شکل وصورت دینے کے لیے فنی وسائل استعمال کیا ہوگا۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ وہ محض فرسودہ لوگ نہیں تھے

۔جیسا کہ ارباب ارتقا دعویٰ کرتے ہیں۔

تصویر میں دکھائی گئیں یہ بانسریاں اوسطاً پنچانوے ہزار سال پرانی ہیں۔دس ہزار سال پہلے رہنے والے لوگوں کے اندر موسیقی پر راگ الاپنے کا ذوق موجود تھا۔

488

''پالش شدہ پتھر والا'' فریب :

آثار قدیمہ کے باقیات میں بہت سے دل کش سنگی فن پارے آج تک موجود ہیں۔پتھروں کو ایسی واضح اور باقاعدہ شکل دینے کے لیے اسٹیل کے مضبوط اوزاروں کے عام طور پر استعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک شخص ایسے خوب صورت اوزار اور مجسّمے محض ایک پتھر کو دوسرے پتھر سے رگڑنے یا کھرچنے سے نہیں بنا سکتا۔گرینائٹ کی طرح سخت پتھروں کی صحیح طور پر تراش خراش نیز ان کی سطحوں پر نقوش سازی کے لیے فنی اساس کی ضرورت ہوتی ہے۔

پتھر والے بہت سے اوزار کی تیزی اور چمک دمک ان کی صحیح کٹائی اور عمدہ تشکیل کی عکاسی کرتی ہے۔جیسا کہ نظریہ ارتقا والے سائنس داں اس دور کی خاکہ کشی کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ یہ پالش شدہ پتھر والے دور سے ہو کر آئے ہیں،مکمل طور پر سائنسی حقائق سے عاری بات ہے۔پالش کا تحفظ ہزاروں سال تک کرنا ناممکن ہے،تصویروں میں دکھائے گئے یہ پتھر چمکتے ہیں کیوں کہ وہ صحیح اندازے کے ساتھ کاٹے گئے ہیں نہ ان کے دعوے کے مطابق اس لیے کہ وہ پالش کر دیے گئے ہیں۔ان کی یہ چمک ان پتھروں کے اندر سے چھن کر آتی ہے۔

کنگنوں کی تصویر میں موجود یہ بائیں طرف والا کنگن سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔اور دائیں طرف والا بسالٹ (سیاہ نرم آتش فشانی پتھر) کا بنا ہوا ہے۔یہ اٹھ ہزار پانچ سو اور نو ہزار سال کے درمیانی دور کے ہیں۔ارباب ارتقا دعویٰ کرتے ہیں کہ اس دور میں محض پتھر کے بنے ہوئے اوزار استعمال ہوتے تھے،لیکن بسالٹ اور سنگ مرمر غیر معمولی طور پر سخت پتھر ہیں،ان کو گھمانے اور گول کڑیاں بنانے کے لیے اسٹیل کے پھل اور

اوزار ضرور استعمال ہوئے ہوں گے،ان کو اسٹیل کے اوزار کے استعمال کے بغیر کاٹنا اور شکل وصورت دینا محال ہوتا ہے۔اگر آج آپ کسی کو پتھر کا ایک ٹکڑا دے دیں اور اس سے کہیں کہ تصویر میں موجود کنگن کی طرح بسالٹ کے اس ٹکڑے سے ایک کنگن بنا دیں تو اس سے کس حد تک کامیابی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ایک پتھر کو دوسرے کے ساتھ رگڑنے یا آپس میں ٹکرانے سے یقینا کنگن نہیں بنائے جاسکتے مزید برآں یہ فن پارے دکھاتے ہیں کہ جن لوگوں نے ان کو بنایا وہ جمالیاتی ذوق وشعور سے بھی آراستہ مہذب انسان تھے۔

ان تصویروں میں سیاہ ، چمکیلے پتھر اور ہڈی کے بنے ہوئے دستی اوزار ،آنکڑے،اور پتھر کی بنی ہوئی مختلف اشیا کو دیکھا جاسکتا ہے۔ بظاہر اس طرح کی باقاعدہ شکلیں ایک پتھر کے ساتھ کسی خام مواد کے رگڑنے سے حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ خام مواد کے پیٹنے سے یہ ہڈیاں تو شکستہ ہو جائیں گے مگر مطلوبہ اشکال بن نہ سکیں گی۔اسی طرح یہ بات واضح ہے کہ صاف لکیروں اور تیز نوکوں کا وجود ناممکن ہے اگر چہ اوزار گرینائٹ اور بسالٹ جیسے سخت ترین پتھروں ہی سے کیوں نہ بنائے گئے ہوں۔پھلوں کے ٹکڑے بنائے جانے کی طرح یہ پتھر باقاعدہ طور پر کاٹے جاتے ہیں۔ان کی چمک کا راز ان کو پالش کرنے میں پنہاں نہیں جیسا کہ ارباب ارتقا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ ان کو شکل وصورت دینے سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔جن لوگوں نے یہ اشیا بنائیں ان کے پاس مطلوبہ انداز میں شکل دینے کے لیے لوہے یا اسٹیل کے اوزار ضرور موجود رہے ہوں گے۔سخت پتھر کی ان سلوں کو محض اسٹیل جیسے سخت تر مادے کے ذریعے ہی ان کی صحیح کٹائی ممکن ہوسکتی ہے۔

489

پتھر کے ذریعہ پتھر پر کندہ کاری نہیں کی جاسکتی :

۱ تقریباً دس ہزار سال پرانے پتھر کی منبت کاری

۲ گیارہ ہزار سال پرانی منگری

۳ دس ہزار سال پرانا سیاہ چمکیلا آلہ

۴ گیارہ ہزار سال پرانے پتھر کے ظروف

۵ نو ہزار اور دس ہزار کے درمیانی عرصے کا فن پارہ جس میں سبز پتھر کی منبت کاری کا سراغ ملتا ہے

۶ تقریباً دس ہزار سال پرانے 'میخ سے مشابہ' کھو کھلے پتھر کی منبت کاری

۷ دس ہزار سال پرانا ہتھوڑا

پتھر کے یہ اوزار اوسطاً دس ہزار سال سے لے کر گیارہ ہزار سال کے درمیانی عرصے کے ہیں۔تصور کریں کہ آپ ان میں سے کسی پتھر کو دوسرے کے ساتھ پیٹنے سے ایک آلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ ارباب ارتقانے اس دور کے بارے میں دعویٰ کیا ہے ،اور چوتھی تصویر میں موجود سراخوں کی طرح با قاعدہ سراخ بنانے کی کوشش کریں اپنے ہاتھ میں موجود پتھر کے اس ٹکڑے کو آپ جتنی مرتبہ بھی پیٹیں گے کبھی بھی ایک مکمل سراخ بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔اس کے لیے آپ کو اسٹیل کی طرح نسبتاً سخت مادے کے بنے ہوئے برمے کے استعمال کی ضرورت ہوگی۔

492

آج کے موجودہ مذہب برحق کی طرح تاریخ کے مختلف ادوار میں دوسرے اوہام پرستانہ عقائد موجود رہے ہیں۔تمام ادوار میں اہل اسلام احکام الٰہی کی پابندی کا مذہبی فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔

493

بت پرستی اور اوہام پرستانہ عقائد کے حامل لوگ آج بھی موجود ہیں جیسے کہ قدیم دور میں موجود رہے ہیں۔

حضرت سلیمان اور ملکہ سبا۔مصنفہ فرانس پرنکس سکنڈ دا ینگر،موسی،دس بیوکس آرٹ ،کیومپر،فرانس۔

Solomon and the Queen of Sheba, by Frans Francken II the Younger,

Musee des Beaux-Arts, Quimper, France

494

لاکھوں سال پرانے وہ ٹکڑے جن کی ارباب ارتقا کوئی نہیں توجیہ پیش کر سکتے :

ارتقا کے نظریے کے مطابق جان دار یا ذی روح اشیا لاکھوں سالوں پر محیط ایک خیالی سلسلے میں واقع ہونے والے جرثومہ سے لے کر انسان تک ارتقا کے مختلف مراحل سے ہوکر آئی ہیں۔

انسان اس ارتقائی سلسلے کی آخری ذی روح شے ہے۔اور گزشتہ بیس ہزار سال کے دوران اپنی ترقی کو مکمل کر چکا ہے۔مگر سائنسی دریافتیں اور آثار قدیمہ کے دستاویزات اس سلسلہ کی کڑیوں کی تائید نہیں کرتے۔درحقیقت وہ دکھاتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں۔

دوسری دریافتیں ان اوزار اور اشیاے تزیین پر مشتمل ہیں جو کسی وقت میں لاکھوں سال قبل انسان کے زیر استعمال تھے۔ڈارون کے نظریے کے مویدین اپنے خیالی ارتقائی شجرے میں کسی ایسے انسان کو جگہ نہیں دے سکتے جو پانچ کروڑ یا پچاس کروڑ برس قبل رہتا تھا۔وہ وقت جس کے بارے میں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ زمین پر ٹربولائٹ کے علاوہ کوئی جان دار شے موجود نہیں تھی اور ان کے لیے ایسا کرنا یقینا ناممکن ہے۔اللہ تعالیٰ نے دوسری تمام ذی روح اشیا کی طرح انسان کو محض امر ''کن'' سے وجود میں لایا۔اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ سو سال پہلے زندگی گزارنے والے لوگوں کی طرح ہم پچاس کروڑ سال قبل والے لوگوں کے باقیات کے بارے میں انکشافات کر سکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ جس نے تمام اشیا کو نیست سے ہست کیا وہ تاریخ کے جس دور میں بھی وہ چاہے کسی بھی زندہ شے کو اپنی منشا کے مطابق یقینا وجود میں لا سکتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں۔لیکن ڈارونسٹ اس حقیقت کو سمجھنے میں ناکام ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ تخلیق کے تمام حقائق کے لیے کوئی تعبیر وتشریح نہیں پیش کر سکتے۔سائنسی حقائق کے ذریعہ غلط ثابت کردہ منظرناموں کی تکرار کے علاوہ ان کے پاس مزید کوئی حل موجود نہیں ہے لیکن ہر روز کے گزرنے کے ساتھ جاری کھدائیوں سے فراہم شدہ ثبوت ارتقا کے نظریہ کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔

تقریباً دس لاکھ سال قبل پرانا یہ دھات کا گولہ ان کئی سونادر چیزوں میں سے ایک ہے

جوجنوبی افریقہ کی سرزمین پر برآمدہ ہوا ہے۔ان میں موجود سلیقے سے بنائی گئی جھریاں کسی طبعی مظہر کا نتیجہ نہیں ہوسکتیں۔یہ دریافت ثابت کرتی ہے کہ بالکل ابتدائی ادوار ہی سے انسان دھاتوں کا استعمال کرتا چلا آرہا ہے اور لاکھوں سالوں سے ان کے پاس دھاتوں میں باریک جھریاں بنانے کی ٹکنالوجی موجود رہی ہے۔

-۱۹۱۲ء- میں اُکلاہوما کے علاقہ تھومس میں بلدیاتی بجلی کے پلانٹ کے دو ملازمین نے کوئلے جھونکتے وقت ایک عجیب وغریب دریافت کی۔کوئلے کا ایک ٹھوس اور اتنا بڑا کہ اسے استعمال میں لانا ممکن نہ تھا۔تو ایک ملازم نے اسے توڑ کر دیکھا تو اس کے اندر سے لوہے کا ایک برتن نمودار ہوگیا، جب اس کو نکالا گیا تو کوئلے میں اس برتن کی شکل وصورت بنی ہوئی تھی۔کوئلے کا معائنہ کرنے کے بعد بہت سے ماہرین نے بتایا کہ یہ برتن تقریباً تین سو اور تین سو پچیس ملین سال کے درمیانی دور کا تھا۔ارباب ارتقا اس دریافت کی توجیہ بیان نہیں کرسکتے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ لوہے کا استعمال تقریباً بارہ سو قبل مسیح کے درمیان ہوا۔

امریکہ کے سائنسی رسالے کی ۵/جون-۱۸۵۲ء- والی اشاعت میں ایک لاکھ سال قبل کے دھاتی برتنوں کے باقیات کی دریافت کے بارے میں ایک رپورٹ شائع ہوئی۔یہ گھنٹی نما برتن رنگ میں جست سے مشابہ تھا، یا ایک ایسا مرکب دھات تھا جس کا بڑا حصہ چاندی کا تھا۔اس کی سطح پر گلدستوں یا پھولوں اور انگور کی بیل یا پھولوں کے ہار کی شکلیں باریکی سے بنائی گئی تھیں۔ارباب ارتقا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ بالکل ہی ابتدائی ادوار میں دھات کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔وہ اس دریافت کی توجیہ بیان نہیں کرسکتے۔یہ بات ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے یہ فن پارے بنائے ان کے پاس ایک ترقی یافتہ ثقافت موجود تھی اور وہ دھاتی مرکبات اور دھاتی اشیا بنانے کے قابل تھے۔

495

اس قدیم جوتے کا تلا دو اکیس کروڑ تین لاکھ سال پرانی چٹان سے ملا۔لاکھوں سال پہلے انسان جوتے پہنا کرتے تھے، اور بلاشبہہ کپڑے پہنتے تھے، وسیع معاشی تعلقات رکھتے تھے اور پرشوکت ثقافت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔اس قدیم حجریے کی ایک مشہور تصویر-

۱۹۲۲ء- میں نیو یارک کے اخبار میں شائع ہوئی۔ انسانی تاریخ کی ارتقا کے بارے میں دعوؤں کی تردید کرتی اس قسم کی دریافتوں کو یا توصیغہ خفا میں رکھ دیے جاتے ہیں یا ان سے غفلت برتی جاتی ہے۔

ہاؤن اور مونگری والی یہ تصویر- ۱۸۷۷ء- میں ٹیبل ماؤنٹین کی نیچے سے بہنے والے قدیم دریا کی تلہٹی سے برآمد ہوئی۔ اس دریا کی تلہٹی تقریباً تین کروڑ تیس لاکھ سال پرانی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان ہمیشہ انسان ہی کے طور پر زندگی بسر کرتا آیا ہے۔

انسانی چہرے سے مشابہ شکل اس تیس لاکھ سال پرانے چقماق کے ٹکڑے پر کندہ کاری کی گئی ہے۔ چقماق میں اس طرح کے باقاعدہ سراخ کرنا ایک مشکل کام ہے اور اس مقصد کے لیے دھات کے بنے ہوئے خاص اوزار درکار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ارباب ارتقا تجویز کرتے ہیں اس طرح کے فرسودہ حالات کے تحت ایسا کرنا ممکن نہیں۔

496

مڈونا مذہبی چیدہ افراد ساتھ۔ مصنفہ گیونی بیلینی، وینس- ۱۵۰۵ء-

499

اکیسویں صدی۔ کولمبیا

یہاں تک کہ اکیسویں صدی میں بھی بہت سے معاشرے اوہام پرستانہ عقائد کے حامل ہیں۔ وہ جھوٹے خداؤں کی عبادت کیا کرتے ہیں جو ان کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ یہاں ہم آرہواکو انڈینز کے سردار کو دیکھتے ہیں جو آسیب پہنچنے کے بعد مذہبی رسوم کی قیادت کررہا ہے۔ سردار بیان کرتا ہے کہ وہ فطرت کی ان قدیم روحوں سے استغاثہ کرتے ہیں کہ پہاڑ کے جوش کو ٹھنڈا کردیں۔ (اسٹیفن فیری، ''نگران عالم''، قومی جغرافیہ، اکتوبر ۲۰۰۴ء)

اکیسویں صدی۔ میاما، امریکہ

دنیا کے ایک حصے میں لوگ فرسودہ حالات میں رہ رہے ہیں جب کہ ایک دوسرے براعظم میں لوگ پرتعیش فلک بوس عمارتوں میں زندگی بسر کررہے ہیں، ہوائی جہازوں اور

آرام دہ اور تیز رفتار سمندری جہازوں میں سفر کر رہے ہیں۔ ارباب ارتقا کے دعوؤں کے برخلاف ترقی یافتہ اور" فرسودہ" دونوں معاشرے ایک ہی دور میں ہمیشہ موجود رہے ہیں جیسا کہ آج ہے۔

500

وہ ماحول جہاں پر لوگ رہتے ہیں یہ نہیں دکھاتا کہ ان کے اذہان مبینہ طور پر فرسودہ یا ترقی یافتہ ہیں۔ ہر دور میں لوگ مختلف حالات کے تحت زندگی بسر کرتے آئے ہیں اور مختلف ضرورتوں کی تکمیل کے درپے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر قدیم مصریوں کی فن تعمیر کی سمجھ بوجھ ہم سے مختلف تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہماری ثقافت خواہ مخواہ طور پر پیش رفتہ ہے۔ جب کہ بیسویں صدی کی تہذیب کی ایک نشانی قدیم مصر میں اہرام اور بوالہول کی شکل میں موجود فلک بوس عمارتیں ہیں۔

کئی ارتقا پسند ایسے منظر نامے پیدا کر کے کسی ثبوت کی غیر موجودگی میں اپنے دعوؤں کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر چہ ہر نئی دریافت کی غلط انداز میں تعبیر کی جاتی ہے مگر واضح طور پر وہ چند حقائق کو آشکار کرتی ہے جن میں سے ایک یہ ہے: انسان اپنے روزِ اول ہی سے انسان رہا ہے۔ ذہانت اور فنی مہارت جیسی صفات تاریخ کے تمام ادوار میں ایک جیسے رہی ہیں وہ لوگ جو ماضی میں زندگی گزارتے تھے فرسودہ، نیم انسان نیم جانور جیسے حیوان نہیں تھے جیسا کہ ارباب ارتقا ہمیں باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہماری طرح سوچ و فکر رکھتے تھے اور انسانوں سے ہم کلام ہوتے تھے۔ اور انھوں نے ایسے شاہکار فن پارے بنائے نیز ثقافتی اور اخلاقی ساختوں کی بنیاد ڈالی۔ جیسا کہ ہم مختصر طور پر دیکھیں گے آثار قدیمہ اور حجریات کی دریافتیں اس بات کو واضح اور غیر نزاعی طور پر ثابت کرتی ہیں۔

502

-۲۰۰۰ء-

ماہرین آثار قدیمہ اپنے ارتقائی تعصب کے ساتھ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ جنوبی فرانس میں پائیرینیز کے پہاڑوں کے دامن میں واقع ٹک ڈاؤڈوبرٹ (Tuc

(d'Audoubert کے غار میں موجود بھینسے والے وہ مجسّمے ہیں جو نام نہاد فرسودہ انسانوں نے بنائے -روڈن- کے مجسّموں کی طرح آج کے فن پاروں سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔لیکن ان مجسّموں کے جمالیاتی ذوق اور طریقہ کار دکھاتے ہیں کہ ان کے بنانے والے جسمانی یا ذہنی طور پر آج کے انسانوں سے مختلف نہ تھے۔اور درحقیقت ان کی اکثریت فنی طور پر کافی دسترس رکھتے تھے۔

-۸۰۰۰ء-

اگر روڈن کا ''مفکر'' آج سے چھ ہزار سال قبل دریافت کیا جاتا اور لوگ اس کی تعبیر اس تعصب کے ساتھ کرتے جیسا کہ بعض سائنس دان ماضی کی تعبیر کرتے آئے ہیں تو وہ سوچتے ہوں گے کہ بیسویں صدی کے لوگ ایک سوچنے والے انسان کی عبادت کرتے تھے ،اور ابھی مہذب نہیں بنے تھے۔وغیرہ وغیرہ تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ حقیقت سے بہت دور ہوں گے۔

503

صحیح تاریخ کو پردۂ خفا میں رکھ دیا گیا ہے

تاریخ کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں اس کا اکثر حصہ ہم نے کتابوں سے سیکھا ہے قارئین بعض اوقات ایسی کتابوں کے مضامین پر شک کرتے ہیں اور ان کے مضامین کو محض دکھاوے کی حد تک قبول کرتے ہیں۔لیکن خصوصا جب بات انسانی تاریخ کی آتی ہے تو اکثر و بیشتر کتابیں ایک ایسے نظریے کو پیش کرتی ہیں جو کسی تصور کی پیداوار ہو،جس کی علم حیاتیات ،مالیکیولر بیالوجی، پیلنٹالوجی، جینٹکس ، بایوجینٹکس اور انتھروپالوجی کے میدانوں میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی ۔نظریہ ارتقا کی سائنسی زوال کے ساتھ اس کی بنیاد پر تاریخ کی ہماری سمجھ بھی غلط ہے۔

تاریخ داں ایڈورڈ اے فری مین (A.....Freeman) اس موضوع پر بحث کرتا ہے کہ ہمارا تاریخی علم کس طرح حقائق کی انعکاسی کرتا ہے۔

تمام تاریخی سوالات میں ہمارا واسطہ ان حقائق سے پڑتا ہے جو انسانی مرضی اور اس

کے کردار کے ضبط سے ہوکر آتا ہے ۔اور وہ شہادت کا انحصار انسانی معلومات دینے والے انسان کی ضمیر کی ایمان داری پر ہوتا ہے۔ جو یا تو قصداً دھوکہ دے سکتا ہے یا غیر شعوری طور پر گمراہ کرسکتا ہے۔

انسان جھوٹ بول سکتا ہے اور وہ غلطی کا ارتکاب کرسکتا ہے۔٦

پس بھلا ہم کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ ہمارے حوالے کی گئی تاریخ سچی ہے۔

سب سے پہلے تاریخ دانوں اور آثار قدیمہ کے علما کی طرف سے ہم کو پیش کیے گئے حقائق کی واقعیت پر یقین دہانی ضروری ہے۔جیسا کہ اکثر خیالی نظریات کے ساتھ تاریخ کی تعبیر کا مطلب مختلف لوگوں کی مختلف چیزیں ہوسکتی ہیں۔ایک واقعہ کی توجیہ اس کے بیان کرنے والے شخص کے نکتہ نظر کے مطابق مختلف ہوسکتی ہے، اور واقعات کی تعبیر اکثر مختلف ہوتی ہے جب بیان کرنے والے افراد چشم دید گواہ نہ ہوں۔

''تاریخ'' کی تعریف ماضی کے واقعات کے قدیم دستاویز کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ان واقعات کو اہمیت اور معانی اس طرح دی جاتی ہے جیسا کہ تاریخ داں ان کو پیش کرتا ہے۔مثال کے طور پر ایک جنگ کی تاریخ پر مصنف کی رائے اثر انداز ہوسکتی ہے کہ آیا فتح مند گروہ صحیح تھا یا غلط۔اگر ان میں سے کسی ایک گروہ کے ساتھ وہ ہمدردی رکھتا ہے تو وہ ان کو'' آزادی کا چمپئن'' تصور کرے گا۔اگر چہ اس گروہ نے دوسروں کی سرزمین پر حملہ ہی کیوں نہ کیا ہو اور بہت سے مظالم ہی کیوں نہ ڈھائے ہوں۔ ۷

مثال کے طور پر اگر آپ دو حریف قوموں کی تاریخی کتاب کا معائنہ کرتے ہیں تو آپ ملاحظہ کریں گے کہ ہر ایک ان واقعات کو دوسرے سے مکمل طور پر جداگانہ انداز میں مطالعہ کریں گے۔

یہ وہی کچھ ہے جو ارتقا کے حامی تاریخ دانوں اور سائنس دانوں نے آج کیا ہوا ہے۔کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر ایک حقیقت کی حیثیت سے وہ انسانوں کی نام نہاد ارتقائی تاریخ پیش کرتے ہیں۔وہ ان قوی دلیل کو نظر انداز کرتے ہیں جو ان کے نظریے کی تردید کرتے ہیں، اپنے تعصب کے در پردہ دستیاب ثبوتوں کی تعصّبانہ تعبیر کرتے ہیں اور یہ

نظریہ پیش کرتے ہیں جس کو بعض سائنس دانوں نے ایک اصول یا قانون کی حیثیت سے گلے لگا رکھا ہے۔

اگر ایک تاریخ داں دوسری جنگ عظیم کا تجزیہ کرتے ہوئے نیشنل سوشلسٹ نظریات رکھنے والا ہو تو محض زیریں دائیں طرف والی اس تصویر کی بنیاد پر وہ ہٹلر کے ایک عظیم الشان قائد کی حیثیت سے خاکہ کشی کر سکتا ہے۔ مگر بوچن والٹ (Buchenwald) اذیتی کیمپ میں لی گئی زیریں بائیں طرف والی تصویر ہٹلر کی اذیت ناک نسل کشی کی محض ایک مثال پیش کرتی ہے۔

504

ہزار ہا ہزار سال بعد کیا رہ جائے گا؟

تعمیر، صنعت، ٹکنالوجی والے مصنوعات اور روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والے مادوں کی مدت حیات انسان کی زندگی کی بہ نسبت کافی مختصر ہے۔ اگر چند ہزار سال پہلے انسان لکڑی کی بنائی ہوئی نہایت ہی شاندار عمارتوں میں رہتے تھے تو یہ بات مکمل طور پر قابل سمجھ ہے کہ آج ان کی طرز حیات کا سراغ مشکل سے ملے گا۔ تصور کریں کہ ہماری تہذیب اگر کسی خوف ناک حادثے سے دوچار ہو جائے تو لاکھوں سال بعد کیا رہ جائے گا۔ اگر مستقل کے لوگ چند ہڈیوں اور بنیادوں کے چند ٹکڑوں کا مطالعہ کر کے ہم کو فرسودہ تصور کریں تو ان کی یہ تعبیر کہاں تک درست ہوگی۔

چند ہزار سال گزرنے کے بعد آج کی عمارتوں کا کوئی حصہ باقی رہے گا تو وہ پتھر کے چند تختے ہوں گے اور لکڑی کے کچھ ساز و سامان اور لوہے کے بنے ہوئے چند برتن سڑ گل جائیں گے۔ مثال کے طور پر قصر چراغاں کی دیواروں کی باریک تصویر، اس کے خوبصورت فرنیچر، اس کے زیبا پردے اور قالین، جھومر یا روشنی کے دوسرے آلات میں کچھ باقی نہ رہے گا۔ یہ مواد گل سڑ کر ناپید ہو جائیں گے۔ مستقبل بعید میں قصر چراغاں کے باقیات سے کسی کا واسطہ ہوا تو پتھر کے چند بڑے ٹکڑوں اور محل کی بنیادوں کے علاوہ اور کچھ اس کے ہاتھ نہ لگے گا۔ اب اگر اس کی بنیاد پر یہ تجویز کیا جائے کہ ہمارے وقت کے لوگوں نے

بودوباش کے لیے اجتماعی معاشرت کا قیام ابھی نہیں کیا تھا اور پتھروں کو ایک دوسرے پر رکھ کر فرسودہ پناگاہوں میں بسر اوقات کرتے تھے تو یہ تجزیہ کہاں تک مبنی برصداقت ہوگا؟۔آج تک باقی رہنے والے نوادرات کا بھی یہی حال ہے کہ وہ بھی قصر چراغاں کی طرح اپنے وقت کی انتہائی خوب صورت اور عالی شان عمارتیں رہی ہوں گی ۔اگر ایک شخص ان کھنڈرات میں فرنیچر ڈال دے،اوران کو پردوں، قالینوں اور چراغوں سے مزین کردے تو اس کا نتیجہ ایک دفعہ پھر نہایت ہی اثر آفریں ہوگا۔قرآن میں علم ،ثقافت،فن تعمیر اور فنون لطیفہ کے لحاظ سے سابقہ معاشروں کو انتہائی پیش رفتہ دکھایا گیاہے ۔ایک آیت میں ہم کو بتایا گیاہے کہ گزشتہ معاشرے کافی بلند پایہ تھے :

تو کیا انھوں نے زمین میں سفر نہ کیا کہ دیکھتے کیسا انجام ہوا ان سے اگلوں کا ان کی قوت اور زمین میں جو نشانیاں چھوڑ گئے۔ (سورۂ غافر:۴۰/۲۱)

کئی ہزار سالوں کے دوران یہاں پر دکھائی گئیں پتھر کی بنی ہوئی یہ جدید عمارتیں کتل ہویوک (Catal Huyuk) کے مقام پر کھدائی میں دریافت ہونے والے کھنڈرات سے کچھ مختلف دکھائی نہیں دیں گی۔قدرتی حالات کے تحت پہلے لکڑی سڑے گی، پھر دھاتیں زنگ آلود ہوکر نابود ہوجائیں گی ۔گمانِ غالب کے ساتھ اگر کسی چیز کا نشان باقی رہ جائے گا تو وہ پتھر کی دیواریں اور سیرامک کے برتن اور پیالے ہوں گے۔اگر ایسا ہے تو مستقبل کے آثار قدیمہ کا یہ دعویٰ کہ-اکیسویں صدی کے لوگ فرسودہ زندگیاں بسر کرتے تھے-بالکل ہی حقیقت سے تہی ہوگا۔آج کے ارباب ارتقا خود کو ایسی ہی صورت حال سے دوچار پاتے ہیں

505

جلنے کے بعد استنبول کا قصر چراغاں اپنے داخلی نقش ونگار اور زیب وزینت سے بے بہرہ ہوگیا۔اسی حالت میں اسی قصر کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی شخص مکمل طور پر تصور نہیں کرسکتا کہ یہ اپنے وقت کی ایک پرشکوہ عمارت تھی۔

مرمت کے بعد قصر چراغاں اپنے پوری کشش ودمک کے ساتھ۔

506

پندرہ لاکھ سال قبل رہنے والے انسان اپنے بزرگ لوگوں کا خیال کرتے تھے :

-۲۰۰۵ء- کے اندر جارجیا (Georgia) میں دمانیسی (Dmanisi) کے مقام پر ایک قدیم دریافت کے مطابق یہ ایک بار پھر ثابت ہوگیا کہ ''انسانی تاریخ کا ارتقا'' والے منظر نامے کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ارباب ارتقا کے غیر سائنسی دعوؤں کے مطابق پہلے انسان خاندانی یا معاشی نظم و نسق سے عاری جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ تاہم ایک عمر رسیدہ انسان سے تعلق رکھنے والی ایک کھوپڑی کو ماہر آثار قدیمہ ڈیوڈ لوکوپنزے (David Lordkipanidze) نے دریافت کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مذکورہ دعوے غلط ہیں۔

لورڈ کیپا لیز کا تعلق ایک معمر انسان سے تھا جس کا صرف ایک ہی دانت باقی رہ گیا تھا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس کھوپڑی کا مالک دوسری بیماریوں میں ابتلا کے ساتھ اپنے دانتوں سے بھی تقریباً عاری تھا۔ لیکن اتنی بیماریوں میں گھرے رہنے کے باوجود یہ شخص اپنے بڑھاپے تک زندہ رہا، جو اس بات کا اہم ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اس شخص کی نگرانی ہو رہی تھی اور لوگ ایک دوسرے کی فلاح و بہبود میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ لورڈ کیپا لیز (Lordkipalidze) کہتا ہے :

> یہ بات واضح ہے کہ یہ ایک بیمار انسان تھا۔۔۔۔ہم سوچتے ہیں کہ یہ ایک اچھی دلیل ہے کہ اس شخص کو اپنے گروپ کے دوسرے ارکان کی مدد حاصل تھی۔ ۸

ارباب ارتقا کا دعویٰ ہے کہ اس کھوپڑی کے مالک انسان کے مرنے کے تقریباً پندرہ لاکھ سال بعد انسانوں نے معاشی ثقافتی کردار اپنایا۔ یہ مذکورہ دریافت اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ لاکھوں سال پہلے انسان بیماروں کے ساتھ شفقت و مروت کا برتاؤ اور ان کی حفاظت و نگرانی کیا کرتا تھا۔ اس سے ارباب ارتقا کے دعوؤں کی تردید ہوجاتی ہے۔ یہ دریافت ایک بار پھر ثابت کرتی ہے کہ انسان نے ہمیشہ انسان کی طرح نہ کہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کی ہے۔

سالانہ اہم سائنسی دریافتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک خاص شمارے میں ڈس کور

(Discover) رسالہ نے اس دریافت کو قابل غور جگہ دی ہے۔جس نے ثابت کیا ہے کہ لاکھوں سال قبل انسان بیماروں کی نگرانی کیا کرتے تھے، اوران کی بہبودی میں دلچسپی لیتے تھے۔ایک مقالہ بعنوان ''ڈیڈ ہوموارکٹس ☆کڈل ہیز گرینڈ پیرنٹس؟''(کیا فرسودہ انسان اپنے بزرگوں کا خیال رکھتا تھا) میں کیے گئے اس انکشاف نے یہ ثابت کردیا کہ انسانوں نے تاریخ کے کسی بھی دور میں جانوروں کی سی نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیش انسانوں کی کی طرح مہذب زندگی گزاری ہے۔

(☆)ارباب ارتقادعویٰ کرتے ہیں کہ انسان کے مفروضہ ارتقا میں ہوموارکٹس انسانوں اور بندروں کے مابین ایک درمیانی جنس تھی۔تاہم حقیقت یہ ہے کہ آج کے انسانی ڈھانچہ اور ہوموارکٹس کے اس ڈھانچہ میں کوئی فرق نہیں ہے جو مکمل طور پر سیدھا اور بالکل انسانوں کا سا ہے۔

507

لاکس کوکس (Laiscox) کی غاروں میں دریافت کی گئی ایک جداری تصویر کشی ۔واضح طور پر یہ کسی ایسے فرسودہ انسانوں کا کارنامہ نہیں ہوسکتا جنھوں نے ابھی بندروں سے اپنا راستہ جدا کیا ہو۔

508

اگر بعد میں آنے والی نسلیں ارباب ارتقا کے نظریات کی روشنی میں آج کے فن پاروں کا اندازہ لگالیتیں تو ہمارے معاشرے کے بارے میں بہت سی مختلف رائیں سامنے آتیں۔ مستقبل کے ارباب ارتقا پیبلو پیکاسو(Pablo Picasso) یا سلویڈور ڈلی (Salvador Dali) یا دوسرے بالا واقعیت پسندوں کے فن پاروں کا جائزہ لے کر تجویز کریں گے کہ ہمارے دور کے لوگ نسبتاً فرسودہ تھے۔تاہم یہ حقائق کی عکاسی سے یکسر عاری ہوگی۔

وسط : بانسری کے ہمراہ ایک آدمی، پیبلو پیکاسو۔

ستار، پیبلو پیکاسو۔

بائیں: غصیلا گھوڑا، سلویڈ ورڈلی۔
دائیں: واضح چمکیلی گھڑی، سلویڈ ورڈلی

509

یہ تصاویر مصور کی مرئی اور تصوراتی سمجھ کی عکاسی کرتی ہیں۔مگر ان تصاویر سے اس وقت کے لوگوں کے بارے میں نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ کیا کھاتے تھے،کن حالات میں زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے معاشی تعلقات کیا تھے-اور اوپر سے دعویٰ کرنا کہ یہ تبصرے صد فیصد صحیح ہیں ایک غیر سائنسی رویہ ہے-اپنے تعصّبانہ رویوں کے نتیجہ میں ارباب ارتقا نے اصرار کے ساتھ گزشتہ لوگوں کو فرسودہ کہنے کی رٹ لگا رکھی ہے۔اس بائیں تصویر میں موجود صورت کو خمدار لکیروں والے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوگ وحشی نہیں تھے، جو نیم عریاں حالت میں ادھر ادھر گھومتے تھے جیسا کہ ارباب ارتقا دعویٰ کرتے ہیں۔

تقریباً نو ہزار سال قبل الجیریا میں دریافت کی گئیں جداری تصویر کشیاں :

ٹک ڈی اوڈوو برٹ(**Tuc d'Audoubert**)غار میں بھینسا کے ابھرے ہوئے نقوش۔

510

دیوار ہائے غار پر کی گئی اعلیٰ ترین تصویر کشی کا فن :

فرانسیسی پائیرنیس(**Pyrenees**) میں واقع نیوکس(**Niaux**)غار ماقبل التاریخ کے لوگوں کی اثر آفریں تصویروں سے بھری پڑی ہے۔ان تصویروں پر کی گئی کاربن کی تاریخ شناسی دکھاتی ہے کہ یہ تقریباً چودہ ہزار قدیم ہیں۔نیوکس غار کی تصویر کشیاں-۱۹۰۶ء- میں معمورۂ انکشاف میں آئیں اور اس وقت سے اب تک بہت تفصیل کے ساتھ ان کا معائنہ کیا گیا ہے۔اس غار کا مزین ترین حصہ سالون نائر (**Salon Noir**) نامی ایک تاریک حصے میں واقع کشادہ جوفدار کمرہ ہے۔اپنی کتاب(**The Origion of Modern Humans**) نامی کتاب میں راجر لیون (**Roger Lewan**) بھینسا، گھوڑوں،

ہرن، اور سینگ دار پہاڑی بکری والی تصویروں کے ساتھ اس حصے کے بارے میں درج ذیل تبصرہ کرتا ہے :

۔۔۔۔چوکھٹوں میں رکھے گئے، اوران کے عملی نفاذ کے دوران غور وخوض اور دوراندیشی کا تاثر دیتے ہوئے۔ ۱۱

ان تصویروں کے متعلق ایک اہم عنصر جو سائنس دانوں کی انتہائی دلچسپی کا بنا ہے وہ ان کے رنگ سازی کا کرشمہ ہے۔ تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ مقامی اور طبعی مواد کی آمیزش کر کے ان فن کاروں نے خاص مرکبات بنائے ہیں۔ بلاشبہ یہ ان کی اس سوچ، منصوبہ بندی اور صنعت گری کا مظہر ہے جو فرسودہ حال انسانوں کی دسترس سے بالاتر ہے۔ رنگ سازی کی اس مہارت کو لیون یوں بیان کرتا ہے :

رنگ والے مادے اور مقدار میں اضافہ کرنے والے مادوں ہی میں دراصل رنگ سازی کے اجزا ہیں۔ جن کو (Upper Paleolithic) اپر پالیولے تھک لوگ بہت احتیاط کے ساتھ چنتے تھے اور اس سے ایک خاص قسم کا آمیزہ تیار کرنے کے لیے پانچ تا دس مائکرو میٹر والے پاوڈر تک پیستے تھے۔ کالا رنگ جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ کوئلہ اور میگنی ڈائی آکسائیڈ (Manganeedioxide) لیکن حقیقی دلچسپی مقدار میں اضافہ کرنے والے مادوں میں تھی جن کے وہاں پر چار امتیازی نسخے بتائے جاتے تھے، جن کو محققین ایک سے چار تک گنتے ہیں۔ مقدار میں اضافہ کرنے والے مادے رنگ والے مادے کے رنگ کو ابھارنے میں مدد دیتے تھے، جیسا کہ ان کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ رنگ کو ہلکا کیے بغیر رنگ کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ مقدار میں اضافہ کرنے والے معدنیات کے لیے چار نسخے جو نیوکس میں استعمال کیے گئے وہ ٹالک (تدہین کے لیے استعمال ہونے والا نرم وملائم معدن) تھا۔ بیرائٹ اور چٹان بنانے والا پوٹاشیم معدن کا آمیزہ ۔ چٹان بنانے والا پوٹاشیم اکیلا۔ چٹان بنانے والا پوٹاشیم کا بہت زیادہ کالے بھورے سبز رنگ والے معدن

کا آمیزہ۔ کلاٹیس اور اس کے رفقاے کار نے ان مقدار میں اضافہ کرنے والے بعض مادوں پر تجربہ کیا اور ان کو انتہائی موثر پایا۔ ۱۲

یہ انتہائی پیش رفتہ طریقہ کار اس بات کی دلیل ہے کہ ماضی میں کبھی فرسودگی کے نام سے متصف انسان کا کوئی وجود نہیں رہا ہے۔ جب سے انسان وجود میں آیا ہے تو روز اول ہی سے وہ اشرف المخلوقات ہے جو سوچنے بولنے، عقل سے کام لینے، سمجھنے، تجزیہ و تحلیل کرنے، اور صنعت گری کی قابلیت سے آراستہ رہا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ مکمل طور پر غیر معقول اور غیر منطقی ہے کہ انسان نے اس وقت سے ذرا سا پہلے بندروں سے اپنا راستہ جدا کر کے مہذب بن گئے تھے جب وہ لوگ اپنی رنگ سازیوں میں رنگوں کے لیے مقدار میں اضافہ کرنے والے معدنیات استعمال کرتے تھے اور ٹالک، برائٹ، چٹان کی پوٹاشیم اور بایوٹائٹ جیسے مادوں کا استعمال کیا تاکہ مقدار میں اضافہ کرنے والے مواد حاصل کریں۔

غاروں کی رنگ سازی کے لیے استعمال ہونے والے رنگ' آمیزوں سے حاصل کیے گئے تھے جن کا بنانا علم کیمیا کے طالب علم کے لیے آج بھی کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ ان مرکبات کے فارمولے بہت ہی پیچیدہ ہیں اور محض کیمیائی انجینئر ہی ان کو تجربہ گاہوں میں حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ ٹالک، برائٹ، معدنی پوٹاشیم اور بایوٹائٹ جیسے مواد سے حاصل کردہ رنگوں کے لیے ایک مفصل کیمیائی علم درکار ہے۔ اپنے مفروضے کے مطابق ان کے بنانے والوں کو ''حال ہی میں ظہور پذیر ہونے والے'' کے نام سے موصوف نہیں کیا جاسکتا۔

511

بائیں: یہاں پر ایک فن کار نے سہ بعدی تصویر بنائی ہے۔ یہ ایک ایسا اثر ہے جس کو محض ماہر فن ہی استعمال کرسکتا ہے۔ اور یہ بہت سے لوگوں کی صلاحیت سے ورا ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے پینتیس ہزار قبل مسیح میں غاروں والی تصویر کشیاں کیں اور رنگوں کا استعمال کرتے تھے، جو کیمیکلز اور مینگنیز آکسائڈ، آئرن آکسائڈ، آئرن ہایڈروآکسائڈ اور ڈنٹائن جیسے دوسرے کیمیائی مادوں کو استعمال کرتے تھے۔ (ڈنٹائن' ذوالفقرات کے

دندانوں کا اندرونی حصہ ہے جو ہڈیوں میں موجود لحمیات اور کیلشیم پر مشتمل ہے۔) اگر آپ علم کیمیا سے بے بہرہ شخص سے ان تصویروں میں استعمال کیے ہوئے رنگوں کے بنانے کا مطالبہ کریں تو ان کو علم نہ ہوگا کہ کون سے کیمیکلز استعمال کریں، ان کو پاکر ان کی ترکیب کیسے کریں، اور ان کے ساتھ آمیزش کے لیے دوسرے کون سے مادے چاہئیں، اس کے علاوہ اس وقت کے لوگ حیوانات کے علم تشریح سے خوب آگاہ تھے۔ جیسا کہ انھوں نے ذوالفقرات کے دندانوں سے کیلشیم پوڈر اور ہڈیوں کے لحمیات حاصل کر کے اس کے استعمال کی طرف اشاریہ دیا ہے۔

زیریں دائیں جانب گھوڑا، نیوکس غار کی تصویر کشی کا ایک مظہر ہے۔ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یہ تصویر کشی کوئی گیارہ ہزار سال پرانی ہے۔ اس گھوڑے، اور آج اس علاقے میں رہنے والوں کے درمیان قریبی مشابہت ان فن کار کی مہارت کی نمائش میں قابل ذکر ہے۔ جو انتہائی پیش رفتہ ذوق کے مالک تھے۔ غاروں کی دیواروں پر بنائی گئیں مذکورہ تصویر کشیاں اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ اس وقت کے فن کار فرسودہ زندگیاں گزارتے تھے۔ گمانِ غالب ہے کہ وہ محض اپنی ذاتی ترجیح پر ان دیواروں کو کینوس کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔

512

بلوم بس غار میں پائے گئے فن پارے ایک دفعہ پھر انسانی ارتقا کے پس منظر کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں:

جنوبی افریقہ کے ساحل پر واقع بلوم بس غاروں میں کھدائیوں کے دوران کی گئی دریافتوں نے ایک بار پھر انسانی ارتقا کے منظر نامے کو الٹ دیا ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف نے ''پتھر کا زمانہ اتنا گونگا نہیں تھا'' کے عنوان کے تحت یہ قصہ شائع کیا۔ مختلف اخبارات اور رسالوں نے بھی اس کہانی کی اشاعت کیا ہے اور ظاہر کیا کہ ماقبل التاریخ انسان کے بارے میں نظریات کو مکمل طور پر تبدیل کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر بی بی سی نیوز نے خبر دی کہ: سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ دریافت دکھاتی ہے کہ غور و فکر کے جدید طریقے ہماری سوچ سے

بہت پہلے وجود پذیر ہوئے۔ اسی ہزار سال سے لے کر ایک لاکھ سال قبل مٹی اور آئرن آکسائڈ پر مشتمل معدن کے ٹکڑے بلوم بس غاروں میں پائے گئے۔ یہ قیاس آرائی کی گئی ہے کہ وہ تصویری خاکوں اور دوسرے فن پاروں میں استعمال کیے گئے تھے۔ اس کی دریافت سے پہلے سائنس دانوں نے تجویز کیا تھا کہ سوچ سمجھ اور صنعت گری کی شہادت پہلی بار پینتیس ہزار سال پہلے ہی ابھر کر آئی تھی ۔ان نئی دریافتوں نے اس مفروضے کو مکمل طور پر نیست و نابود کر دیا۔اس وقت کے لوگ جن کو ارباب ارتقا فرسودہ اور نیم بندر سے منسوب کرتے ہیں وہ آج کے انسانوں کی طرح سوچ سمجھ اور صنعت گری کی قابلیت سے آراستہ تھے۔

اوپر دکھائی گئیں موتیاں اور مختلف آرائشی ظروف بلوم بس غاروں میں پائے گئے۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت کے لوگوں میں فن کے سمجھنے کی لیاقت تھی اور وہ ذوق و جمال میں دلچسپی لیتے تھے۔ یہ ان فرسودہ انسانوں کی صنعت گری نہیں ہو سکتی۔

چووٹ غار میں دلکش تصویریں :

۱۹۹۴ء میں چوٹ غار میں دریافت کی گئی تصویروں نے سائنسی دنیا میں بڑی ہلچل مچائی اس سے پہلے آردی چے کے فن پارے دلاس کوس میں بیس ہزار سال قبل کی تصاویر اور اسپین میں التمیرا کے مقام پر سترہ ہزار سال پرانے فن پاروں نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی ۔لیکن چوٹ غار کی تصاویر ان سے زیادہ قدیم تر تھیں۔کاربن کے ذریعہ تاریخ کے تعین والے تجزیے ثابت کر دیا کہ یہ تصاویر تقریباً پینتیس ہزار سال پرانے ہیں۔نیشنل جیوگرافک رسالے میں ان کی بابت درج ذیل تبصرہ شائع ہوا :

> پہلی تصویریں خواص اور عوام دونوں کی دلچسپی کا باعث بنیں۔کئی دہائیوں تک ماہرین نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ فن مصوری نے مبہم خاکوں سے لے کر پرکشش، فطرت پسندانہ فن پاروں تک مرحلہ وار ترقی کی ۔۔۔ غاروں کے مشہور تصاویر سے دگنا قدیم چوٹ کی ان نقوش نے نہ صرف ماقبل التاریخی فن پاروں کے عروج کی نمائندگی کی بلکہ اس کی ابتدائی شروعات کی بھی۔ ۱۴

''چوٹ غار میں'' گھوڑے والا مجسمہ تقریباً چھ میٹر (۱۰ فٹ) لمبا ہے۔ غار کے اندر گینڈا، گھنے ایال والے گھوڑے بھینسا، شیر اور سینگ دار پہاڑی بکریوں اور دوسرے کئی جانوروں کی حیران کن حد تک خوبصورت تصویریں موجود ہیں۔ اس وقت کا تیارہ کردہ انتہائی شاہکارانہ فن پارہ جس میں ارباب ارتقا محض شکستہ لکھائیوں کو دیکھنے کی توقع کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی ڈارونسٹ نظریے کی رو سے تشریح نہیں کی جاسکتی۔

غاروں والی تصویریں اس وقت کے لوگوں کے انتہائی پیش رفتہ فنی ذوق کی نمائندگی کرتی ہیں۔ نیشنل جیوگرافک والے رسالہ نے ان کے بنانے والے ماہرین کو ''ہماری طرح کے لوگ'' سے تعبیر کیا ہے۔

بالا بائیں طرف: چوٹ نامی غار میں چیتا کی ایک تصویر جو سرخ مٹی، اور آئرن آکسائڈ پر مشتمل مادے سے بنائی گئی ہے۔

بالا دائیں: گھوڑے کا مجسمہ، قریبی تصویر۔

لاسکوکس میں سولہ ہزار پانچ سو سال قدیمی فلکیاتی نقشے، مینوخ یونیورسٹی کا ایک محقق ڈاکٹر مائیکل ریپنگ لوئنگ نے اپنے مطالعات کے نتیجے میں ثابت کیا ہے کہ مشہور مرکزی فرانس میں لاسکوکس نامی غاروں کے تصاویر فلکیاتی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس نے کمپیوٹر میں غار والی دیواروں پر ان تصویروں کو دوبارہ بنایا جس نے اس نے فوٹوگرامیٹری کا طریقہ استعمال کر کے ثابت کیا کہ ابھر کر آنے والے ہندسی دائروں، زاویوں اور مستقیم لکیروں کی ایک خاص اہمیت رہی ہوگی۔ گرہنی میلان سے متعلق جملہ اعداد و شمار، اعتدال شب و روز کی صحت، کواکب کی باقاعدہ حرکات، سورج اور چاند کا قطر اور نصف قطر اور کائنات میں انعطافات، یہ تمام چیزیں کمپیوٹر کے اعداد و شمار حساب و کتاب میں بڑھادی گئیں۔ نتیجہ کے طور پر یہ تمام خاکے ستاروں کی کہکشاؤں اور خاص قمری حرکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بی بی سی نیوز نے اپنے سائنسی سیکشن میں درج ذیل خبر دی:

رات کو نظر نہ آنے والے آسمان کا ایک ماقبل التاریخ نقشہ مرکزی فرانس میں لاسکوکس کے مقام پر مشہور غاروں کی دیواروں پر تصویروں کی شکل میں ملا،

اس نقشے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سولہ ہزار پانچ سو سال پرانا ہے۔ یہ نقشہ آج کل سمر ٹرائی اینگل (مثلث گرما) کے نام سے مشہور تین چمکدار ستاروں کو دکھاتا ہے۔ پلی یڈس ستاروں کے مجموعے والا نقشہ لاسکوکس کے کچے پلستر والی تصاویر میں پایا گیا ہے۔۔۔ ۱۹۴۰ء۔ میں دریافت کی گئی دیواریں ہمارے قدیم آباؤ اجداد کی فنی مہارت کے نمونے ہیں۔ لیکن یہ تصویر کشیاں ساتھ ہی ان کے سائنسی علم سے آگاہی کے بھی مظہر ہیں۔ ۱۵

ڈارونسٹ دعوؤں کے مطابق جن لوگوں نے ان تصویر کو کھینچا وہ فرضی طور پر ابھی درختوں سے بس اترے ہی تھے، ان کی ذہنی نشوونما ابھی تشنہ تکمیل تھی، تاہم ان تصویر کشیوں کی فن کارانہ قدر و قیمت اور جدید ترین تحقیق کے نتائج ان دعوؤں کو مکمل طور پر بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ جن لوگوں نے بھی ان تصویروں کو اپنے پیچھے چھوڑا وہ اعلیٰ جمالیاتی ذوق، پیش رفتہ فنی مہارت اور سائنسی علم سے آراستہ تھے۔

سائنسی محققین کے مطابق گھوڑے والی تصویر کے نچلے حصے میں موجود یہ نقطے چاند کے انتیس دنوں والی گردش کو غالباً ظاہر کرتے ہیں۔

تصویر آ ہو کے نیچے تیرہ نقاط کی ایک قطار چاند کے ماہانہ گردش کے نصف کی نمائندگی کرتی ہے۔

''قدیم ترین قمری جنتری کی شناخت کی گئی''، کے عنوان سے بی بی سی ویب سائٹ پر ایک رپورٹ ان معلومات پر مشتمل تھی جس نے ایک بار پھر ڈارون کے معاشروں کی ارتقا والے دعوے کی تردید کی۔

514

لاسکوکس نامی غار میں گایوں کی تصاویر

لاسکوکس نامی غار میں بھینسا کی تصاویر

ان تصاویر میں قوت حرکت اور قوت حیات کی مکمل طور پر خاکہ کشی کی گئی ہے کہ جو نہایت دل کش اور خوبیوں کا مجموعہ ہیں۔ ان لوگوں کی فنی مہارت کے برابر ہے جنھوں نے

بڑی بڑی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ دعویٰ کرنا ناممکن ہے کہ جنھوں نے اس قسم کی تصویر بنائی وہ ذہنی طور پر غیر پیش رفتہ تھے۔

515

بالا: لاسکوکس نامی غار سے نام نہاد ''روٹنڈا'' کی شمالی دیوار

زیریں دایاں: لاسکوکس نامی غار سے سترہ ہزار سال پرانے جانوروں کی تصاویر

زیریں بایاں: ایک گھوڑے کی تصویر

516

شمالی افریقہ کی تصاویر اور ابھرے ہوئے نقوش ارباب ارتقا کے لیے سامان حیرت بنے ہوئے ہیں :

تقریباً سات ہزار سال پرانے جیراف کی ابھری ہوئی یہ تصاویر ایسے شاندار اندا زمیں بنائی گئی ہیں جو ایسا تاثر دیتی ہیں کہ ریوڑ حرکت میں ہے۔ ظاہری طور پر یہ تصاویر ان سوچنے والے لوگوں کے فن پارے ہیں جو قوت فیصلہ اور اپنے جذبات وخیالات کے اظہار اور فن کے اسرار ورموز سے واقف تھے۔

سات ہزار سال قدیم یہ دوسری تصویر ایک آدمی کو آلہ موسیقی بجاتے ہوئے دکھاتی ہے ۔اس کے بائیں جانب جدید تصویر بٹسوانا کی مقامی برادری ذو Dzu کے ایک فرد وہ آلہ بجاتے ہوئے دکھاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک موسیقی والا آلہ جس کا استعمال سات ہزار سال پہلے ہوا کرتا تھا وہ آج استعمال ہونے والے آلے کی طرح ہے۔ یہ ڈارونسٹ دعوؤں کو نیست ونابود کرنے کی ایک دوسری دلکش مثال ہے۔ تہذیبیں ہمیشہ ترقی نہیں کرتیں جیسا کہ ڈارونسٹ دعویٰ کرتے ہیں بعض اوقات یہ ہزاروں سال تک یکساں رہتی ہیں جب کہ یہ آدمی ایک سندر آلے کو بجا رہا ہے جو سات ہزار سال پہلے موجود تھا، جب کہ دنیا کے دوسرے کونے میں ڈیجیٹل ہم آہنگ ساز یئے بنائے جا رہے ہیں، جن کے لیے کمپیوٹر کی سب سے ترقی یافتہ ٹکنالوجی استعمال کی جاتی ہے، اور دونوں ثقافتیں ایک ہی وقت میں موجود ہیں۔

زیریں: ایک انسان کی تصویر جو سات ہزار سال قبل کھینچی گئی تصویر میں بانسری

بجا رہا ہے، یہ تصویر دکھاتی ہے کہ اس وقت کے لوگ ایک اعلیٰ ثقافت اور علم موسیقی کے حامل تھے، اور اس طرح وہ ذہنی طور پر پیش رفتہ اور تہذیب یافتہ تھے

زیریں بائیں سمت: یہ تصویر موجودہ بٹسوانے کے ایک باشندے کو اسی قسم کے آلے کو بجاتے دکھارہی ہے۔

تاریخ میں پہلا شہر تصور کیا جانے والا کٹل ہویک ارتقا کی تردید کرتا ہے :

عام طور پر اس کا نو ہزار سال قدیمی ہونا متفقہ ہے۔ تاریخ میں مشہور پہلے شہر کے طور پر کٹل ہویک کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی پہلی دریافتوں نے علم آثار قدیمہ کی دنیا میں بڑے بحث ومباحث کا آغاز کیا جو ارباب ارتقا کے دعوؤں کو ایک دفعہ پھر غلط ثابت کرتی ہیں۔ ماہر آثار قدیمہ جیمس میلرٹ (James Mellart) بیان کرتا ہے کہ اس علاقے کے ترقی یافتہ مقامات نے اس کو آمادہ حیرت کردیا ہے :

> کٹل ہویک کے مقام پر ٹکنالوجی کی بھرمار اس انتہائی پیش رفتہ معاشرے کی ایک ایسی دل کش خصوصیت ہے جو پتھر والے زمانے کے آخری مرحلے کا بظاہر ہراول دستہ تھا۔۔۔ جیسا کہ بطور مثال انھوں نے سیاہ چمکیلے پتھر کے آئینے کو ایک سخت آتش فشانی شیشہ کو بغیر کسی کھرچ مرچ کیکس طرح پالش کردیا، اور کس طریقہ سے انھوں نے پتھر کے دانوں (سیاہ چمکیلے پتھر سمیت) میں اتنے باریک اور چھوٹے سوراخ بنائے کہ باریک جدید اسٹیل کی بنی ہوئی سوئی بھی اس میں سرایت نہیں کرسکتی۔ انھوں نے کب اور کہاں سے تانبے اور سیسے کو پگھلانا سیکھا۔۔۔؟

ان دریافتوں نے ثابت کردیا کہ کٹل ہویک کے باشندے شہری زندگی کی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ منصوبہ بندی، نقشہ کشی اور پیمایش کرنے کے قابل تھے۔ نیز یہ کہ ان کی فنی سمجھ بوجھ تصور سے کہیں زیادہ پیش رفتہ تھی ۔ کھدائی کی ٹیم کا حالیہ لیڈر پروفیسر لان ہوڈر (Professor Ian Hodder) بیان کرتا ہے کہ حاصل کردہ دریافتیں ارباب ارتقا کے دعوؤں کو مکمل طور پر باطل قرار دیتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انھوں نے ایک عجیب وغریب

فن کو معلوم کیا ہے جس کے سرچشمے غیر واضح تھے۔ اور اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ کٹل ہو یک کے جغرافیائی مقام کے تعین کے لیے توجیہ پیش کرنا بہت ہی مشکل کام تھا، ہوڈر کے مطابق اس وقت آباد علاقوں سے جس کا کوئی مستقیماً جغرافیائی ربط نہیں تھا۔ دریافت شدہ کچے پلستر میں کھینچی گئی تصاویر اس دور کی انتہائی پیش رفتہ فن مصوری کو دکھاتی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اس دریافت کے بعد ان لوگوں نے کیوں اور کیسے ایسا اونچا فنی درجہ حاصل کیا۔ حقیقی سوال یہ ہے کہ کس طرح لوگوں کے ایک گروہ نے اس قسم کی دلکش ثقافتی ترقی حاصل کی۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری معلومات کے مطابق کٹل ہو یک میں کی گئی ثقافتی ترقی نے کوئی ارتقائی مرحلہ نہیں طے کیا تھا، وہاں پر اس قسم کے عظیم فن پارے اس وقت کے لوگوں کے تخلیقی ذوق کے شاہکار تھے۔ ۱۷

کٹل ہو یک کے مقام پر ہوئی تمام دریافتیں تاریخ اور ثقافتی ارتقا کے دعوؤں کی تردید کرتی ہیں، یہاں کی جداری تصاویر نام نہاد غاروں والے لوگوں کے فن پارے نہیں ہیں جو محض ابھی وحشی پن کی حالت سے نکلے ہیں بلکہ ان انسانوں کے فن پارے ہیں جو پیچیدہ فن کارانہ قابلیت اور جمالیاتی ذوق سے آراستہ انسان تھے۔

بالا: کٹل ہو یک کی دیواروں کی ایک تصویر۔ ہرن کے شکار کے ایک منظر کو دکھاتی ہوئی۔

چار لاکھ سال پرانے نیزے جنھوں نے ارباب ارتقا کو ششدر کر دیا- ۱۹۹۵ء- میں جرمن ماہر آثار قدیمہ ہرٹ موٹ تھیمے (Hartmut Thieme) نے جرمنی میں اسکوننگن (Schoningen) کے مقام پر لکڑی کے بہت سے نوادرات کو دریافت کیا، یہ بڑی مہارت سے بنائے گئے نیزے تھے۔ بالفاظِ دیگر دنیا کے سب سے قدیم ترین مشہور شکاری آلات تھے۔ یہ تصویر ارباب ارتقا کے لیے بڑی حیرانگی کا باعث بنی جن کی نظر میں شکار کا باقاعدہ آغاز تقریباً چالیس ہزار سال پہلے ہوا جب جدید انسان فرضی طور پر پہلے نمودار ہوا۔ اپنے ارتقائی جھوٹوں کا لبادہ پہنانے کے لیے اس سے پہلے دریافت کیے گئے کلیکٹن اور لیہرنگن کے نیزوں کی اہمیت کو محض کھدائی کی چھڑیاں یا برف کی گہرائی معلوم کرنے کی

حد تک گھٹا کر رکھ دی گئی۔ ۱۸

تاہم سچی بات یہ ہے کہ اسکوننگن والے نیزے تقریباً چار لاکھ سال قدیم تر نکلے ۔علاوہ ازیں ان کا زمانہ اتنا یقینی تھا کہ شی فیلڈ یونیورسٹی (Sheffield University) کے ماہر آثار قدیمہ روبن ڈنیل (Robin Dennell) کے مقالے کو نیچر رسالہ میں شائع کیا گیا جس میں وہ لکھتا ہے کہ ان کی تاریخوں کو بدلنا یا ان کی جھوٹی تعبیر کرنا ناممکن تھا۔۔۔ لیکن اسکوننگن کی دریافتیں یہ بلاشبہہ نیزے ہی ہیں۔۔لہٰذا۔ان کو کھدائی کی چھڑیاں کہنا یا برف کی گہرائی معلوم کرنے کا آلہ تصور کرنا ایسا ہی ہے جیسے یہ دعویٰ کرنا کہ بجلی والے برمے کاغذ داب ہیں۔ ۱۹

ایک وجہ جس کے باعث ان نیزوں نے ارتقاوالے سائنس دانوں کو اتنا حیران و پریشان کیا یہ وہ غلط نظریہ ہے کہ فرضی طور پر اس وقت کا فرسودہ انسان ظروف بنانے کی قابلیت سے عاری تھی۔مگر یہ نیزے ایک ایسے ذہن کی پیداوار ہیں جو نہ صرف پیمایش کرنے بلکہ ہر میدان کے شہ سوار ہیں۔تقریباً تیس سال پرانی جرمن صنوبر کے تنے ہر قسم کے نیزے بنانے کے لیے استعمال ہوئے ہیں جس کا نوک اس مرکزی حصے سے بنایا گیا جو لکڑی کا سخت ترین حصہ ہے، ہر نیزے کو آج کے جدید معیاروں کے مطابق بالکل صحیح تناسب کے ساتھ بنایا گیا ہے۔اس کے مرکز ثقل کا فاصلہ اپنے تیز سرے سے پیچھے کی طرف ۱ / ۳ تھا۔

ان تمام معلومات کی روشنی میں روبن ڈنیل تبصرہ کرتا ہے :

> یہ نیزے قابل غور کاریگری اور مہارت کے استعمال کے مظہر ہیں جس کے لیے ایک موزوں درخت کو چنا جاتا ہے، اس کا خاکہ تیار کیا جاتا ہے اور آخری مرحلہ میں اس کو نیزے کی صورت دی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ نام نہاد انسان بے ساختہ اور 'پانچ منٹ والی ثقافت' میں نہیں رہ رہے تھے جو فوری حالات کے ردعمل میں ابن الوقتی سے کام لے رہے ہوں۔ منصوبہ بندی کی قابل غور گہرائی، خاکے کی پیچیدگی اور لکڑی کی صحیح کٹائی کے لیے درکار صبر و تحمل ایک خاص حد تک محض جدید انسان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ۲۰

نیزوں کی دریافت کرنے والاشمیے بیان کرتا ہے :

میڈل پلسٹوسینو جیسے ابتدائی ادوار میں ان پیچیدہ نیزوں کے استعمال کا مطلب یہ ہے کہ فرسودہ انسانی رویے اور ثقافت کے بارے میں بہت سے جدید نظریات پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔۲۱

جیسا کہ ہارموشیے اور روبن دنیل بیان کرتے ہیں انسانی تاریخ سے متعلق ڈارونسٹ دعوے حقائق کی عکاسی نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کبھی ارتقا سے ہو کر نہیں گزرا۔ پس ماندہ تہذیبیں، اور انتہائی پیش رفتہ تہذیبیں ماضی میں ساتھ ساتھ رہ چکی ہیں۔

گوبک لی تپے میں موجود تہذیب کے آثار :

سائنس دان ان دریافتوں کو ''غیر معمولی اور بے مثال'' تصور کرتے ہیں جو ترکی میں عرفہ کے نزدیک گوبک لی تپے کی کھدائی کے دوران حاصل ہوئیں یہ دیو قامت T شکل والے ستون تھے، جو انسانی قامت سے لمبے اور جن کے قطر بیس میٹر (۶۵ فٹ) تھے اور ان پر جانوروں کے ابھرے ہوئے نقوش کندہ کیے گئے تھے، ان کو ایک دائرے میں ترتیب دیا گیا تھا وہ خصوصی امتیاز جس نے سائنسی دنیا کو متاثر کیا وہ اس تعمیر قریبا گیارہ ہزار سالہ قبل کا زمانہ تھا۔ ارباب ارتقا کے دعوؤں کے مطابق اس وقت کے لوگوں نے یہ عظیم الشان عمارت محض فرسودہ پتھر کے اوزاروں کو استعمال کرتے ہوئے بنائی ہوگی، اس غلط نظریے کے مطابق ان مذکورہ عمارتوں میں انجینئرنگ کا عجوبہ، شکار کی خاطر جمع ہونے اور کھوج لگانے والے لوگوں کا فن پارہ تھا جو گیارہ ہزار سال قبل انتہائی فرسودہ آلات کا استعمال کیا کرتے تھے۔ یقینا یہ بالکل قابل یقین نہیں۔ گوبیکلے تپے کے مقام پر کھدائی ٹیم کے لیڈر پروفیسر کلاس شمط نے اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں تصور کے برعکس غور وفکر کی صلاحیت کا موجود ہونا آشکار ہوتا ہے۔

شمط بیان کرتا ہے یہ لوگ فرسودہ نہیں تھے اور ان کو بندر نما مخلوق تصور نہیں کرنا چاہیے جو ابھی ابھی درختوں سے اترے ہوں اور ایک تہذیب کی تعمیر کی کوشش شروع کی ہو، ذہانت کے اعتبار سے وہ ہم جیسے معلوم ہوتے ہیں۔۲۲

ماہر آثار قدیمہ شمط نے اس بات کے تعین کے لیے ایک چھوٹا سا تجربہ کیا کہ یہ دیو قامت ستون کس طرح اس وقت کے حالات کے مطابق منتقل کر دیے گئے، اور کس طرح ان کو شکل وصورت دی گئی۔ وہ اور اس کی ٹیم نے مشنری کی مدد کے بغیر پتھر کے بڑے تختوں کو کاٹنے کی کوشش کی جیسا کہ ماقبل التاریخ انسانوں نے ارباب ارتقا کے مطابق محض فرسودہ آلات کا استعمال کیا۔ پھر انھوں نے ایک معمولی سے فاصلے تک لے جانے کی کوشش کی، ٹیم کے ایک حصے نے سادہ اور قدرتی چرخیاں بنانے کے لیے پتھر پر کندوں، رسیوں اور قوت بازو کا استعمال کیا۔ اسی دوران دوسروں نے ستون بنانے کی جگہ تیار کرنے کے لیے پتھر والے دستی اوزار استعمال کرتے ہوئے زمین کھودنا شروع کر دیا جیسا کہ نو ہزار سال پہلے ماہرین تعمیر کیا کرتے تھے۔ تاریخ کی بابت ارباب ارتقا کا یہ عقیدہ ہے کہ اس دور میں لوہے کے اوزار استعمال کرنے کا رواج نہیں تھا تو پتھر کے دور کے انسان سخت چقماق کو استعمال کرتے تھے، کاریگروں نے پتھر کاٹنے کے لیے دو گھنٹوں کی مسلسل کوشش جاری رکھی اور بالآخر وہ محض ایک مبہم لکیر بنا سکے۔ بارہ افراد پر مشتمل ایک ٹیم نے پتھر کے ان تختوں کو حرکت دینے کے لیے کوئی چار گھنٹے تک کوشش کی مگر اس کو محض کوئی چھ میٹر یا بیس فٹ تک ہی حرکت دے سکے۔ اس سادے سے تجربہ نے ثابت کیا کہ پتھر کے محض گولائی والے حصے کو بنانے کی خاطر سیکڑوں کاریگروں کو کئی مہینوں کی کوشش درکار ہوگی۔ واضح ہے کہ اس وقت کے لوگوں نے انتہائی پیش رفتہ مہارت استعمال کی ہوگی نہ کہ فرسودہ طریقے جیسا کہ ارباب ارتقا تجویز کرتے ہیں۔

ایک دوسرا عدم تواتر ارباب ارتقا کے وقتی حدود میں یہ ہے کہ وہ اس دور کو "pre-pottery Neolithic Age" (ظروف سازی سے پہلے پتھر والا عہد) کا نام دیتے ہیں جب ان فن پاروں کو بنایا گیا۔

اس غیر حقیقی تعبیر کے مطابق اس وقت کے لوگوں نے ابھی تک برتن بنانے کی ٹکنالوجی نہیں حاصل کی تھی یہ جانتے ہوئے کہ وہ مجسّموں کو بناتے تھے، دیو قامت پتھروں کی نقل وحمل کرتے تھے، اس سے دل فریب ستون بناتے تھے، اس پر جانوروں کے ابھرے نقوش

کی کندہ کاری کرتے تھے، اپنی دیواروں کی آرائش خوب صورت تصویروں سے کرتے تھے، انجینئرنگ اور فن تعمیر والے علوم استعمال کرتے تھے۔تو کیا بھلا ہم ان کے بارے میں یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ وہ مٹی سے برتن بنانے کے فن سے ناآشنا تھے؟۔یہ پرفریب دعوے محض اس لیے مسلسل دہرائے جاتے ہیں تاکہ ارباب ارتقا کے دعوؤں کی حمایت کی جاسکے۔ بلاشبہہ مذکورہ فن پارے ثابت کرتے ہیں کہ ان کے بنانے والوں کے پاس زیادہ پیش رفتہ علم ،ٹکنالوجی اور تہذیب موجود تھی، جو ماضی میں ان کے بارے میں تصور کیا جاتا تھا۔یہ ایک بار پھر ثابت کرتا ہے کہ وہ بالکل ہی فرسودہ انسان نہیں تھے۔ترکی کے ایک رسالے بیلیم وے تکنیک(Bilim ve Teknik) کے ایک مقالے میں دوٹوک مذکور ہے کہ گوبکلی تپے کی دریافتیں انسانی تاریخ کے بارے میں وسیع وعریض غلط نظریات کی حقیقت کو آشکار کرتی ہیں

یہ نئی معلومات ظاہر کرتی ہیں کہ انسانی تاریخ کے بارے میں ایک سنگین غلط نظریے کو قائم کیا گیا ہے۔۲۳

غلطی اس میں ہے کہ تاریخ کی تعبیر ارتقا والے فریب کی روشنی میں کی گئی ہے۔

گوبکلی تپے کے مقام پر پائے گئے ان T شکل والے پتھروں پر شیروں کی تصاویر کندہ ہیں۔

520

ارباب ارتقا اس دور کا ذکر کرتے ہیں کہ ان ظروف کی تاریخ پتھر والے زمانے تک پہنچتی ہے جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ محض پتھر کے اوزار استعمال ہوتے تھے ۔تاہم دریافت کیے گئے ظروف دکھاتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ چٹانوں پر کھینچی گئی جانوروں کی موزوں تصاویر محض پتھروں کے استعمال سے حاصل نہیں کی جاسکتیں اور نہ مجسّموں کی آنکھیں، ناک اور منہ بنائے جاسکتے ہیں نیز شیر کی تصاویر جو اس علاقے میں بعض ستونوں پر کندہ کی گئی ہیں۔

گوبیکلی تپے میں پایا گیا ایک انسانی مجسمہ

گوبیکلی تپے میں دریافت شدہ ایک جنگلی سور کا مجسمہ

سابقہ ثقافتوں کے پیچھے چھوڑے گئے وہ نشانات جن سے ہمارا اکثر وبیشتر واسطہ پڑتا رہتا ہے وہ ان کے بنائے ہوئے ظروف ہیں۔ایسے برتنوں کو بنا کر بہت سے لوگ آج بھی اپنا ذریعہ معاش حاصل کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے اس دور کے محض چند ٹکڑے باقی رہ جائیں اور مستقبل کے سائنس داں ان کو پالیں اور یہ تجویز کریں کہ ہماری تہذیب دھاتوں کے استعمال سے بے خبر تھی تو ان کا دعویٰ کہاں تک صحیح ہوگا؟۔

521

پتھروں کو مختلف شکل وصورت دینے کے لیے ان سے نسبتاً سخت تر لوہے اور اسٹیل کے اوزار درکار ہوتے ہیں ۔آج کے پتھروں کے معماروں کی طرح ماضی کے معمار اور دست کار ایسے پتھروں کو شکل وصورت دینے اور ان کی تراش خراش کے لیے اس قسم کی دھاتوں کے اوزار استعمال کیا کرتے تھے۔

دھاتوں کے علاج کے لیے آٹھ ہزار سال قبل پیشہ ورانہ طریقے استعمال ہوا کرتے تھے ۔ پاکستان میں کی گئی کھدائیوں نے ثابت کردیا ہے کہ آٹھ سال سے بھی زیادہ قبل دندان ساز دانتوں کی خرابی دور کرنے کے لیے ان میں برمے لگاتے تھے،کولمبیا کی میسوری یونیورسٹی کے پروفیسر اینڈری کوسینا (Andrea Cucina) نے آٹھ اور نو ہزار سال کے درمیان قدیم چبانے والے دانتوں پر تحقیق کی جو تقریباً دو اعشاریہ پانچ ملی میٹر قطر والے باریک سوراخوں پر مشتمل تھے،ان سوراخوں کے کمال سے متاثر ہوتے ہوئے کوسینا نے اپنی تحقیق کو وسعت دی تاکہ اس کی ٹیم ان سراخوں کو الیکٹرانک خوردبین کے ذریعہ معائنہ کرے۔ان پر منکشف ہوا کہ ان باریک سراخوں کے کنارے اتنی خوبی کے ساتھ گول تھے کہ جنھیں بیکٹیر یا کا عمل نہیں کہا جا سکتا بالفاظِ دیگر یہ کوئی فطری جوف نہیں تھے بلکہ علاج کی خاطر مصنوعی عمل کا نتیجہ تھا۔کسی بھی دانت میں گلنے سڑنے کے کوئی آثار نہیں تھے جیسا کہ نیو سائنٹسٹ میگزین نے یہ تجویز کیا کہ ''وہ محض ماقبل التاریخ دندان سازوں کی شہادت ہوسکتی ہے''۔ ۲۴

اس دوران ارباب ارتقا کے اصول کے مطابق انسانوں نے محض حال ہی میں

بندروں سے اپنی راہیں الگ کی تھیں، وہ انتہائی فرسودہ حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے اور محض ابھی مٹی کے برتن بنانا سیکھا تھا اور وہ بھی محض چند علاقوں میں۔ ایسے فرسودہ حالات میں لوگوں نے طبی علاج کے مرہون منت دانتوں میں کس طرح ایسے باکمال جوف بنانے میں کامیابی حاصل کی جب کہ ان کے پاس کوئی ٹکنالوجی موجود نہ تھی۔ ظاہری بات ہے کہ نہ تو وہ لوگ اور نہ وہ حالات فرسودہ تھے جن میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کے برعکس ان کو بیماریوں کی تشخیص کے علم پر بھی دسترس تھی اور علاج ومعالجہ کے طریقہ کار بھی معلوم تھے اور ان طریقوں کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے ان کے پاس فنی وسائل بھی مہیا تھے۔ یہ شہادت ایک دفعہ پھر ڈارونسٹوں کے اس دعوے کی تردید کرتی ہے کہ معاشرے فرسودگی سے جدیدیت کی طرف ارتقا کرنے لگے۔

522

قدیم زمانے کے لوگ موسیقی کے دلدادہ تھے :

تقریباً ایک لاکھ سال قبل موجود لوگوں نے موسیقی میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا یہ اس کا ایک دوسرا ثبوت ہے کہ ان لوگوں میں آج کے دور کی طرح ذوق وشوق کی فروانی موجود تھی۔ قدیم ترین مشہور آلہ موسیقی جو لیبیا کے ہوافتیہ (Haua Fteah) علاقے سے دریافت ہوا وہ ایک قدیم بانسری جو پرندے کی ہڈی سے بنی ہوئی ہے اور اندازۃً ستر سے لے کر اسی ہزار سال تک پرانی ہے۔ ۲۵

پرولم سیکنڈ مشرقی کریمیا میں وہ علاقہ ہے جہاں پر اکتالیس سیٹیوں کا مجموعہ پایا گیا۔ ۲۶

اس علاقے کی تاریخ نوے ہزار اور لاکھ سال کے درمیان ہے۔ ۲۷

تاہم اس وقت کے لوگوں کا علم موسیقی ان سے بھی قدیم تر ہے۔ ماہر علم موسیقی بوب فنک (Bob Fink) نے شمالی یوگوسلاویہ کے غار میں ریچھ کی ران کی ہڈی سے بنائی گئی ایک دوسری بانسری کا تجزیہ کیا جسے ماہر آثار قدیمہ ایوان ترک نے جولائی ۔۱۹۹۵ء۔ میں دریافت کیا تھا۔ فنک نے ثابت کیا کہ یہ بانسری جس کی ریڈیو کاربن ٹیسٹوں کے ذریعہ متعین

کی گئی تاریخ کا دورانیہ ۴۳ ہزار ۶۷ ہزار سال کے درمیان تھا، یہ بانسری چار قسم کے سازوں کو نکالتی تھی، اور اس میں آدھی اور پوری آوازیں بھی تھیں، یہ دریافت دکھاتی ہے کہ نینڈرتھال قبیلے سات سازوں کا پیمانہ استعمال کرتے تھے- جو آج کی مغربی موسیقی کا بنیادی فارمولہ ہے-اس بانسری کا معائنہ کرتے ہوئے فنک نے نوٹ کیا کہ اس کے دوسرے اور تیسرے سوراخ کے درمیان فاصلہ تیسرے اور چوتھے سوراخ کے درمیان والے فاصلے کا دگنا تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلا فاصلہ پوری آواز کے لیے اور اگلا فاصلہ آدھی آواز کے لیے ہے۔

فنک نے لکھا ''یہ تین آوازیں ۔۔۔لازمی طور پر دو آوازوں والی ہیں اور معیاری دو آوازوں والے قدیم یا جدید پیمانے کی کسی بھی قسم کے درمیان غالباً پوری مناسبت محسوس ہوگی''۔یہ آشکار کرتا ہے کہ نینڈرتھال قوم موسیقی کے علم سے آراستہ اور اس کی شوقین تھی۔۲۸

یہ فن پارے اور قدیم دریافتیں بہت سے سوالات کو جنم دیتی ہیں کہ ڈارونزم جو اس بات کی حمایت کرتا ہے کہ انسان اور بندر ایک ہی مشترکہ آباؤ اجداد سے ہو کر آئے ہیں، ان سوالات کے جوابات دینے سے قاصر ہے ۔مثال کے طور پر ان کے دعوی کے مطابق ہزاروں سال پہلے بندر جیسی مخلوق رہتی تھی جو محض بھنبھناتی اور وحشیانہ زندگی گزارتی تھی ۔ انھوں نے معاشرتی مخلوق بننا کیوں اور کیسے شروع کر دیا۔یہ ارباب ارتقا کے لیے ایک بہت بڑا معمہ ہے۔ارتقا کا نظریہ کسی بھی سائنسی اور منطقی جوابات سے تہی دامن ہے کہ آخر یہ بندر جیسی مخلوق درختوں سے زمین پر کیوں اتر آئی، کس طرح وہ دو پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے، ان کی صلاحتیں اور قابلیتیں کس طرح اجاگر ہوئیں، ان معموں کی ''تشریحات'' محض خواب وخیال پر مبنی خود ساختہ نظریوں اور جھوٹے قصوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ایک شاخ سے دوسری شاخ پر کودنے والے ان بندروں نے کس طرح زمین پر اترنے کا فیصلہ کیا، اگر آپ ارباب ارتقا سے یہ سوال کرتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ یہ موسمیاتی حالات کے تحت وقوع پذیر ہوا۔نظریہ ارتقا ذہن میں ابھرنے والے مذکورہ سوال کا کوئی معقول اور منطقی جواب فراہم نہیں کر سکے گا۔ کیوں دوسرے بندر شاخوں پر رہنے کے لیے

رضا مند ہو گئے جب کہ وہ زمین پر اترنے والوں کی نقل اتار سکتے تھے۔ یا یہ کہ ان موسمیاتی عناصر نے محض چند بندروں ہی کو کیوں متاثر کیا، انہی موسمیاتی اثرات کے تحت درختوں سے اترنے میں دوسروں کے لیے کیا چیز مزاحم بنی۔ اگر آپ یہ پوچھیں کہ ایسا کیوں کر ممکن ہوا کہ بندر زمین پر اتر آئے اور انھوں نے دو پاؤں پر چلنا شروع کیا تو ارباب ارتقا مختلف توجیہات پیش کریں گے۔ مثال کے طور پر بعض کہیں گے کہ اس بندر نما مخلوق نے دو پاؤں پر سیدھا چلنے کا فیصلہ اس لیے کیا تا کہ دشمنوں کے خلاف بہتر انداز میں اپنا دفاع کر سکیں مگر ان میں سے کوئی جواب سائنسی نہیں ہے۔

پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ دو پائیت کے ارتقا کی طرح کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ انسان دو پاؤں پر سیدھا چلتا ہے، یہ حرکت کی ایک خاص حالت ہے جو دوسرے اجناس میں دکھائی نہیں دیتی، ایک سب سے اہم نکتہ جس کی وضاحت از حد ضروری ہے وہ یہ کہ دو پائیت کوئی ارتقائی اقدام نہیں ہے۔ انسان کے دو پایوں پر حرکت سے بندر کی چال نسبتاً زیادہ آسان، تیز تر اور اثر آفریں ہے۔ انسان چمپانزی کی طرح ایک درخت سے دوسرے درخت پر کود نہیں سکتا اور نہ چیتا کی طرح ایک سو پچیس کلومیٹر (۸۰ میل) فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ اس کے برعکس چوں کہ ہم دو پاؤں کا استعمال کرتے ہیں تو ہم زمین پر بہت ہی آہستہ چلتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم کائنات میں تمام اجناس کی نسبت سب سے کم محفوظ ہیں۔ ارتقا کے نظریے کی منطق کے مطابق بندروں کو دو پاؤں پر چلن اختیار کرنے کی طرف مائل نہیں ہونا چاہیے، اس کی بجائے انسانوں کو چار پا بننا چاہیے تھا تا کہ خود کا تحفظ کر سکیں اور سب سے موزوں مخلوق بن سکیں۔

ارتقائی دعوؤں کی تغلیط یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ دو پائیت ڈارونزم کے ''درجہ بدرجہ ترقی'' کے نمونے میں موزوں نہیں ہو سکتی جو ارتقا کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا تقاضا ہے کہ دو پائیت اور چار پائیت کے درمیان ایک ''مرکب'' ترقی ہونی چاہیے۔ تاہم ۱۹۹۶ء میں کی گئی کمپیوٹرائزڈ تحقیق کے نتیجے میں برطانوی علم تشریح کے ماہر روبن کرومپٹن (**Robin Crompton**) نے ثابت کر دیا کہ اس طرح کی مرکب ترقی

ممکن نہیں ہے۔ کرومپٹن اس نتیجہ پر پہنچا کہ جاندار یا تو سیدھا چل سکتا ہے یا چار پاؤں پر
۲۹۔

ان دو کے درمیان کسی بھی ''دوغلی'' قسم کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں انتہائی توانائی صرف کرنا درکار ہوگی۔ اس طرح ایک نیم دو پایہ مخلوق موجود نہیں رہ سکتی۔

ان فرضی فرسودہ مخلوق نے کس طرح ذہین معاشرتی رویہ اختیار کیا اس کا جواب ارباب ارتقا کی یاوہ گوئیوں کے مطابق یہ ہے کہ لوگوں نے گروہوں کی شکل میں اکٹھے زندگی گزارتے ہوئے ذہین اور معاشی رویہ اپنایا۔ مگر بن مانس، چمپانزی، بندر اور بہت سے دوسرے حیوانی اجناس بھی گروہوں اور ریوڑوں کی شکل میں رہتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی انسانوں کی طرح ذہین اور معاشی رویہ نہیں اختیار کیا۔ ان میں سے کسی نے بھی یادگاریں نہیں بنائیں، یا فلکیات میں دلچسپی نہیں لی یا فن پارے نہیں بنائے، کیوں کہ ذہین تخلیقی رویہ محض انسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ تمام فن پارے جو ماضی سے اب تک باقی رہے ہیں انسانوں نے حقیقی فنی مہارت کے ساتھ بنائے تھے۔ یہ نظریہ کہ یہ لوگ فرسودہ زندگیاں بسر کرتے تھے، اس کی تردید آثار قدیمہ کے حقائق کر دیتے ہیں۔

نینڈرتھال قوم کی بنائی ہوئی یہ بانسری دکھاتی ہے کہ یہ لوگ مغربی موسیقی کی بنیاد کا درجہ رکھنے والی ہفت ساز پیمانے استعمال کرتے تھے۔ بانسری بنانے کے لیے ایک الگ قسم کی معلومات، ثقافت اور قابلیتوں کی ضرورت ہے جب کہ اس کو بجانے کے لیے دوسری قسم کی۔

523

ارباب ارتقا اپنے نظریے کی حمایت کے لیے سائنسی دلائل سے تہی دامن ہیں۔ اور وہ بغیر کسی شہادت کے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان اور بندر ایک مشترکہ آباؤ اجداد سے ہو کر آئے ہیں جب ان سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ یہ ارتقا کس طرح ہو کر آئی تو وہ بالکل غیر سائنسی انداز میں جواب دیتے ہیں :

> آج تو ہم نہیں جانتے لیکن امید ہے کہ ایک دن ہم اس کے جواب دینے کے قابل ہو سکیں گے۔

مثال کے طور پر ارتقاوالے ماہربشریات الینے مورگن(Elaine Morgan)یہ اعتراف کرتا ہے :

انسانی ارتقاکے بارے میں چاراہم معمے یہ ہیں۔۱: وہ دو پاؤں پر کیوں چلتے ہیں۔۲: ان کے بال کیوں غائب ہوگئے۔۳: ان کے دماغ اتنے کشادہ دماغ کیوں ہوگئے؟۔۴: انھوں نے بولنا کیوں سیکھا۔

ان سوالات کے دقیانوس جوابات یہ ہیں۔۱: ہم اب تک نہیں جانتے۔۲: ہم اب تک نہیں جانتے۔۳: ہم اب تک نہیں جانتے۔۴: ہم اب تک نہیں جانتے۔سوالات کی فہرست جوابات کے اکتادینے والی یکسانیت پر اثرانداز ہوئے بغیر قابل غور حد تک لمبی ہوسکتی ہے۔۳۰

524

انسانی تاریخ کے ارتقاوالی تصویر کی تردید کرنے والی دریافتیں :

ماہر علم آثار قدیمہ مائیکل اے۔کریمو(Michael A. Cremo)اور ریچرڈ ایل تومسن (Richard L. Thompson)کی کتاب" The Hidden History of the Human Race: Forbidden Archeology"(انسانی نسل کی خفیہ تاریخ: آثار قدیمہ کا علم ممنوعہ) میں فراہم کی گئی شہادت' ارباب ارتقا کی مویدہ ارتقاے انسانی کی تصویر کو الٹ دیتی ہے۔یہ کتاب ارباب ارتقاکے نقطہ نظر سے بالکل مختلف تاریخ کے غیر متوقع ادوار والے باقیات کو درج کرتی ہے۔مثال کے طور پر-۱۹۵۰ء- میں کینڈا کے نیشنل میوزیم میں ایک ماہر بشریات تومس ،ای،لی(Thomas E. Lee)نے ہوران جھیل میں مانی ٹولین(Manitoulin) جزیرہ پرواقع شیگو یندخ(Sheguiandah)کے مقام پر کھدائیاں کیں،وہاں پر پیچھے چھوڑی گئی ریت اور کنکری کے ڈھیر میں برفانی تودوں کی تہ سے اس نے کچھ آلات برآمد کیے۔جب یہ منکشف ہوا کہ یہ پینسٹھ ہزار اور ایک لاکھ پچیس ہزار سال کے درمیانی ہیں تو اس نے اپنی تحقیق کے نتائج کی اشاعت کو موخر کردیا۔کیوں کہ سائنسی دنیا پر حاوی اس

خودساختہ نظریے کے مطابق انسان سب سے پہلے سائبیریا سے شمالی امریکہ میں محض ایک لاکھ بیس ہزار سال قبل پہنچا، اور یہ دعویٰ کرنا ناممکن تھا کہ اس سے پہلے یہ وقوع پذیر ہوا ہے۔

ارجن ٹینیا میں میرامر (Miramar) کے مقام پر تیس لاکھ سالہ قدیم اور سالم پلیو سینے (Pliocene) نامی عمارت سے ماہر آثار قدیمہ کارلوس امیگینو (Carlos Ameghino) کے ذریعہ دریافت شدہ پتھر والے اوزار والی ایک دوسری مثال کتاب کے اندر فراہم کی گئی ہے۔ انہی تہوں سے اس نے جنوبی امریکہ کی دودھ پلانے والے سمدار ٹاکسوڈان (Toxodon) کے نام سے ایک نایاب جانور کی ران کو نکالا۔ اس ران کے اندر دسنگی تیر یا نیزے کی ایک نوک پڑا ہوا تھا، بعد میں ایک دوسرے محقق نے اسی تعمیر میں انسانی جبڑے کا ایک ٹکڑا پایا، مگر ڈارونسٹوں کے مطابق انسان محض ایک لاکھ سے لے کر ایک لاکھ پچاس ہزار سال قبل تیر کی نوک اور پتھر والے گولے بنانے کا قابل بنا۔ اس لیے تیس لاکھ سال پرانی کسی بھی ہڈی اور تیر والی نوک وہ مظاہر ہیں جن کی تعبیر ارباب ارتقا کے بس سے باہر ہے۔ ایک بار پھر یہ ثابت کرتی ہے کہ ارتقا کا نظریہ سائنس کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ ۳۱

برطانوی محقق اور مصنف مائیکل بائیگنٹ (Michael Baigent) اپنی کتاب "Ancient Traces" (قدیم دریافتیں) میں بیان کرتا ہے کہ دو ارب چھ کروڑ اور تین اَرب دو کروڑ کے درمیان کس طرح سونے کی ایک زنجیر -۱۸۹۱ء- میں پائی گئی، اس نے منکشف کیا کہ یہ زنجیر آٹھ قیراط سونے کی تھی جو آٹھ حصے سونے کو سولہ حصہ والی کسی دوسری دھات کے ساتھ ملا کر بنائی گئی، کوئلے کے ایک ٹکڑے کے اندر سے برآمد ہوئی اس زنجیر کا درمیانی حصہ کھلا ہوا تھا، اور اس کے دونوں سرے سختی سے جڑے ہوئے تھے۔ کوئلے میں اس کے کھلے ہوئے حصے کی واضح نشانیاں باقی رہیں، یہ سب کچھ دکھاتا ہے کہ اس زنجیر کی مدت حیات کوئلے کی حیات سے کچھ کم نہ تھی۔ کوئلے میں پائی جانے والی زنجیر کی اس پرت کی عمر کوئی دو ارب چھ کروڑ اور تین اَرب دو کروڑ کے درمیان تھی۔ ۳۲

سونے کی زنجیر کی دریافت ایک ایسے دور کا پتا دیتی ہے جس کے بارے میں ارباب

ارتقا دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان ابھی وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ یہ انسانی تاریخ کے بارے میں ارتقا پسندوں کے کھینچے گئے خاکوں کو مکمل طور پر نیست و نابود کر دیتا ہے۔

یہ حقیقت کہ ایک معاشرہ زیورات کا استعمال کرتا ہے اور آرائشی ظروف کو بناتا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ اس معاشرے کے افراد ایک مہذب زندگی سے لطف اندوز ہوتے تھے اس کے علاوہ سونے کی زنجیر بنانے کے لیے فنی مہارت اور آلات درکار ہیں، محض پتھر کے اوزار استعمال کر کے کچے سونے سے باقاعدہ سونے کی زنجیر نہیں بنائی جاسکتی۔ یہ حقیقت آشکار ہے کہ ہمارے دور سے کروڑوں سال پہلے رہنے والے انسان زیورات بنانے کے فن سے آگاہ تھے اور خوبصورت اشیا سے متلذذ ہوا کرتے تھے۔

ایک دوسری دریافت جو تاریخی ارتقا کے نظریے کو اُلٹ دیتی ہے وہ اندازۃً تین ارب آٹھ کروڑ ستر لاکھ سال پرانی میخ کا ایک ٹکڑا ہے۔ انجمن ترقی سائنس کے ایک رکن سر ڈیوڈ بیروسٹر (Sir David Brewster) کی رپورٹ کے مطابق یہ میخ بھر بھرے پتھر کے ایک ٹکڑے میں پائی گئی، جس تہ سے یہ پتھر برآمد ہوا اس کی تاریخ تقریباً تین ارب آٹھ کروڑ ستر لاکھ سال قدیم ابتدائی ڈیوونین (Devonian) دور تک پہنچتی ہے۔ یہ اور اس طرح کی اور بہت سی دوسری دریافتوں کی مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ انسان ایک نیم حیوانی جاندار نہیں تھا جیسا کہ ارباب ارتقا ہم سے اعتقاد رکھنے کا سوچتے ہیں، اور ان لوگوں نے کبھی بھی بہیمانہ زندگی نہیں بسر کی۔ اس طرح کی مثالوں کو درج کرتے ہوئے مائیکل بائگنٹ درج ذیل تبصرہ کرنے پر اتر آتا ہے :

> ۔۔۔واضح طور پر یہ ناممکن بات ہے کہ ان معلومات کو دنیا کی تاریخ کی کسی روایتی سائنسی سوجھ بوجھ میں جگہ دی جاسکے۔۔۔جن حالات کا ہم نے جائزہ لیا ہے ان میں سے کسی ایک حالت میں بھی اس کا ثبوت نہیں مل سکا تو درحقیقت یہ شہادت واضح کرتی ہے کہ جدید حالت میں موجود یہ انسان یقیناً بہت ہی لمبے دور سے اس کرۂ ارضی پر قدم رنجہ ہوتے چلے آرہے ہیں۔ ۳۴

آثار قدیمہ کی تاریخ اس قسم کی دریافتوں سے بھری پڑی ہے، جیسے کہ بائگنٹ بیان

کرتا ہے کہ ''روایتی'' ارتقا پسند ذہنیت اس کے بالمقابل نہایت ہی بے بسی کی حالت میں ہے۔لیکن ارباب ارتقا کی شاطرانہ چالیں محتاط انداز میں ان اہم نمونوں کو عوام کی نظروں سے پرے رکھتی ہے اور خود ان سے پہلو تہی کر لیتی ہے۔ڈارونسٹ اپنے نظریے کو زندہ رکھنے کی جتنی بھی جدوجہد کریں اتنی ہی بڑھتی ہوئی شہادتیں دکھاتی ہیں کہ ارتقا ایک جھوٹ اور تخلیق ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیست سے ہست میں لایا اس کے اندر روح پھونکی اور اس کو غیر معلوم چیزیں سکھائیں۔اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انسان اپنے وجود کے روزِ اول ہی سے انسانی زندگی بسر کرتا آیا ہے۔

(Ein Gev I) کے مقام پر کھدائیوں کی دریافتیں تاریخ کے ارتقا کے دعوے کی تردید کرتی ہیں۔

تحقیق بتاتی ہے کہ ہزاروں سال پہلے رہنے والے انسان ایسے آلات استعمال کیا کرتے تھے جو آج کل دیہی علاقوں میں رواج پذیر ہیں۔اناجوں کو پیسنے کے لیے چکی کے پاٹ، پتھر والے ہاؤن اور درانتی آج کے موجودہ فلسطین میں این گیو I کے مقام پر پندرہ ہزار سال قبل مسیح ایک جھونپڑی کی بنیاد میں کھدائیوں کے دوران پائی گئیں۔ان اوزاروں میں قدیم ترین کی تاریخ پچاس ہزار قبل مسیح سے بھی پہلے کی ہے۔۳۵

ان کھدائیوں سے پائے گئے تمام ظروف اور اشیا ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کی ضروریات ہر دور میں تقریباً ایک جیسی رہی ہیں۔انسان نے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے جو لوازمات اپنائے ہیں وہ ایک دوسرے کے بہت مشابہ ہیں۔اور اپنے وقت کی ٹکنالوجی کی راست تناسب سے ہیں۔فصل کی کٹائی اور اناجوں کے پیسنے کے لیے وہ اوزار جو آج بھی دیہی علاقوں کی سب سے بڑی ضرورت ہیں، مذکورہ ادوار میں بھی استعمال ہوا کرتے تھے۔

527

آج انتہائی ترقی یافتہ تہذیبوں کے ساتھ نسبتاً پس ماندہ تہذیبیں بھی موجود ہیں تاہم بعض معاشروں کے ٹکنالوجی میں زیادہ پیش رفتہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ذہنی اور جسمانی

طور پر انھوں نے زیادہ نشوونما کر لی ہے۔

528

فریب :

اس تصویر میں دکھائی گئی فرسودہ مخلوق نام کی کوئی چیز کبھی موجود نہیں رہی ہے۔ یہ اور اس سے مشابہ تصاویر ڈارونسٹ سائنس دانوں کے تخیلات کا نتیجہ ہیں اور ان کی اپنی کوئی سائنسی قدر و قیمت نہیں۔

لوگوں کا شکار اور زراعت کے ذریعہ باقی رہنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ یا پس ماندہ ہیں۔ بالفاظِ دیگر کسی معاشرے کے شکار کے وسیلے سے باقی رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کا سر رشتہ فرضی طور پر بندروں سے جا ملتا ہے۔ اور کسی معاشرے کا زراعت میں مشغول ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے بندروں سے اپنی راہیں عرصہ دراز پہلے جدا کی ہیں۔

533

اہرام کی تعمیر میں استعمال کی گئی مہارت اور ٹکنالوجی تاہنوز ایک راز ہے۔ یہ دیو قامت عمارتیں جن کی نقل اتارنا آج کی ٹکنالوجی استعمال کرتے ہوئے بھی نہایت مشکل ہوگا۔ دو ہزار پانچ سو سال پہلے انتہائی ماہر لوگوں نے اس کو عملی جامہ پہنایا۔

534

روڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) کی کتاب ”Just So Stories“ (خواہ مخواہ کی کہانیاں)

536

دنیا کی ایک مشہور ترین پتھر والی تعمیر نیوگرینگ جو ترانوے بڑے پتھروں پر مشتمل ہے۔

نیوگرینگ میں دروازے اور قبہ نما چھتوں والے پتھر۔ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ پتھر کے تختے کس طرح وہاں پر منتقل کر دیے گئے۔ اور اس کی تعمیر کے دوران کون

سے طریقہ کار زیر استعمال رہے۔

537

امکان ہے کہ اسٹون ہنج ایک لکڑی والی ساخت کے تعمیری تختوں کی طرح کھڑی کر دی گئی۔ اس پر کھڑی کی گئی لکڑی کی اس تعمیر پر ہوا اور طوفان اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ بات یقینی ہے کہ اس تعمیر کے محض بنیادیں ہی بچی ہوئی ہیں۔ اسٹون ہنج کی تعمیر میں استعمال ہونے والے طریقے اور محرک ابھی تک زیر بحث مسئلہ ہے لیکن سائنس دانوں کی آشکار کردہ ایک اہم خصوصیت کو فلکیات کے ساتھ متعلق مانا ہے۔ جن لوگوں نے یہ تعمیرات کیں وہ فلکیات اور اس طرح انجینئر نگ کے پیش رفتہ علم سے آراستہ تھے۔

538

جنوب امریکہ کے شہر تیاہونا کو میں استعمال شدہ کئی ٹنوں سے زیادہ وزن والے پتھروں کو اسٹیل کے تاروں، چرخیوں اور دوسرے تعمیراتی آلات کے بغیر ان کے جائے تعمیر پر منتقل کرنا ناممکن ہے۔

539

تقریباً دس ٹن وزن والے باب الشمس کی تعمیر ٹکنالوجی کے وسائل سے محروم لوگ نہیں کر سکتے تھے، جیسا کہ ارباب ارتقا اس دور کے بارے میں ایسا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس قسم کی تعمیرات فرسودگی سے ترقی یافتہ کی طرف ارتقائے تاریخ انسانی کی تردید کرتی ہیں۔

540

گیارہ ہزار سال پہلے گوبیکلی تپے پر پتھر کی تعمیر :

تصاویر میں پتھر کے بنائے ہوئے ظروف اور ان کی تفصیلی شکلیں ان لوگون کے فن کارانہ ذوق کا مظاہرہ کرتی ہیں جنھوں نے گیارہ ہزار سال قبل انھیں معرض وجود میں لایا۔ تاہم اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فن کاروں نے ضرور ان پتھروں کو کاٹنے کے لیے دھاتی اوزار کا استعمال کیا ہوگا، نہ کہ ایک پتھر کو دوسرے کے ساتھ مار کر یا رگڑ کر۔ ایسے باریک فن پارے کی ایجاد آج کی پتھر کی تعمیرات میں استعمال ہونے والے خراد، ریتی

اور آرے کے استعمال کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

بالا دائیں طرف تصویر آج کل کے ایک پتھر والے معمار کو اس طرح کے آلات کو بروے کار لاتے ہوئے دکھاتی ہے۔ گیارہ ہزار سال قبل رہنے والے فن کاروں نے اس طرح کے طریقہ کار کو استعمال کرتے ہوئے اپنے فن پاروں کو بنایا ہوگا۔

بیس ہزار ٹن وزن والے دیو قامت تعمیراتی تختے :

پیرو میں کسکو کے قریب ساکھ ساہوامن (Sacsahuaman) کے قدیم انکان شہر میں ایک ایسی دیوار ہے جو کئی ٹنوں والے پتھر کے بلاکوں سے بنائی گئی ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ ایسی مربوط ہے کہ ان کے درمیان کاغذ کے کسی ٹکڑے کو گھریسنا ناممکن ہے۔ مزید برآں ان میں کسی بھی جگہ پر سمنٹ یا گارے کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ پتھر کے ان بلاکوں کو انتہائی مہارت اور باریک بینی کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ کس طرح ان ضخیم بلاکوں کو ایسی شکل وصورت دی گئی کہ وہ آپس میں مکمل طور پر فٹ ہوسکیں، اس کی تحلیل سے آج کی ٹکنالوجی بھی ششدر ہے۔

اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ اس تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھر کا ایک تختہ دوسرے تمام تختوں سے بڑا ہے۔ اس تختے کی سائز پانچ منزلہ گھر کی سی ہے۔ اور اس کا وزن تقریباً بیس ہزار ٹن ہے۔ سکسا ہوامان کے معماروں نے کس طرح اس کو منتقل کیا یہ ابھی تک صیغہ راز میں ہے۔ آج کی مشینری سے بھی اس طرح کا حیران کن طور پر بھاری وزن والے پتھر کا اٹھانا ناممکن ہے۔ آج دنیا کی سب سے بڑی چرخی کے لیے بھی ایسے وزن اٹھانا مشکل پڑ جائے گا۔ اس وقت کے انکاس شہر نے اپنے پورے یقین کے ساتھ بعض ایسی ٹکنالوجی کا استعمال کیا جن کا آج بھی ہم سوچ نہیں سکتے۔

541

تعمیر میں دیو قامت پتھروں کے استعمال کے لیے انتہائی مہارت کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔ ہزاروں ٹنوں وزن رکھنے والے پتھروں کا ان عمارتوں میں سلیقے کے ساتھ استعمال دیکھ کر آج بھی لوگ انگشت بدانداں رہ جاتے ہیں۔ ایسے ضخیم پتھروں کو محض

چرخیوں اور سٹیل کے تاروں جیسے ترقی یافتہ تعمیری آلات کو استعمال کر کے حرکت دینا ممکن ہے۔ کانوں سے ان پتھروں کو نکالنا، ان کو منتقل کرنا، اپنی جگہ پر رکھنا اور ان پر کام کرنا محض لکڑی، کندے، رسیاں اور آسانی سے ٹوٹ جانے والے تانبے کے آلات سے ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ ارباب ارتقا کا دعویٰ ہے کہ اس قسم کے اوزار اس وقت رائج تھے۔ یہ چھوٹی سی تصویر دکھاتی ہے کہ ضخیم رمسیس (Ramses) مجسّمے کا بالائی حصہ محض سٹیل والے تاروں کے ساتھ چرخیوں کا استعمال کر کے منتقل کیا جاسکا۔

بعل بک، مشتری کی عبادت گاہ :

اس تعمیر میں بھی دیو قامت پتھروں کے تختے استعمال ہوئے ہیں جو اَب معبد مشتری کے نام سے مشہور ہے۔ چھوٹی تصویر میں سرخ رنگ سے نشان کردہ پتھر والا تختہ ان تین ضخیم تختوں میں سے ایک ہے جو اس باقی رہنے والی دیوار میں استعمال ہوا ہے۔ ان تین تختوں میں سے ہر ایک تقریباً چار اعشاریہ پانچ میٹر (۱۵رفٹ) اونچا، تین اعشاریہ پانچ میٹر (۱۱رفٹ) چوڑا اور انیس میٹر (۶۲رفٹ) لمبا، ان کا اوسطاً وزن تقریباً آٹھ سوٹن ہے۔ ایسے ضخیم تختوں کا کانوں سے نکالنا اور جائے تعمیر پر منتقل کرنا تجویز کرتا ہے کہ اس کے لیے جدید تعمیری آلات کا استعمال ضرور ہوا ہوگا۔

542

ارباب ارتقا یادگاری ستونوں کی تشریح سے قاصر ہیں :

حیران کن باقیات میں سے ایک وہ یادگاری ستون بھی ہیں جو ماضی کی تہذیبوں نے ہمارے دور کو ورثہ میں دیا ہے۔ ۲۰ میٹر (۶۵ فٹ) لمبائی اور کئی ٹن وزن والے ان سیدھے پتھروں کو کانوں سے نکال کر منتقل کرنا پھر ان کی سطحوں کو کاٹنا اور سیدھی حالت میں ان کو گاڑنے کے لیے انتہائی پیش رفتہ ٹکنالوجیاں ضرور استعمال ہوئی ہوں گی۔ ان یادگاری ستونوں میں سے ایک مشہور اور قدیم ترین وہ ہے جو تقریباً ایک ہزار چار سو قبل مسیح میں مصر میں کرنک (Karnak) کے مقام پر کھڑا کیا گیا ہے۔ اس کی اونچائی انتیس اعشاریہ پانچ میٹر (۹۷رفٹ)، چوڑائی ایک اعشاریہ چھ دو (پانچ اعشاریہ تین فٹ) اور وزن تین سو پچیس ٹن

ہے۔ایسے ضخیم اور وزنی تختوں کو ایک ہی سل میں اپنے موجودہ مقام پر کان سے لے جانے کے لیے فنی مہارت اور مناسب بنیادی لوازمات ضروری ہیں۔ کانسی اور تانبے کے آلات آسانی سے مڑ جاتے ہیں اور قابل استعمال نہیں رہتے ،اس لیے یقینی طور پر لوہے اور سٹیل کے اوزار درکار تھے ۔یہ بات ارباب ارتقا کے اس دعوے کی تردید کرتی ہے کہ لوہے اور اس طرح کی دوسری دھاتوں کا مذکورہ دور میں استعمال غیر معروف تھا۔

وہ حصہ جوان یادگاری ستونوں کے بام پر تصور کیا جانے والا حصہ (جیسا کہ سرخ دائرے میں دکھایا گیا ہے) یہ دکھاتا ہے کہ ان کھڑے پتھروں کو بجلی کے راڈوں کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

آسوان (Aswan) کے نزدیک گرینائٹ کی کان میں ایک غیر کامل یادگاری ستون ۔یہ ستون جس کی لمبائی دوسروں سے دگنا یعنی اکتالیس اعشاریہ پچھتر میٹر (۱۳۷ فٹ) اور تقریباً ایک ہزار ایک سو اڑسٹھ ٹن وزنی ہے۔اس دیوقامت پتھر کو کان سے نکالنے اور منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے پیش رفتہ ٹکنالوجی کا استعمال ضرور ہوا ہوگا۔

543

پوماپنکو کے مقام پر ہوئی دریافتیں ارتقا کی تردید کرتی ہیں :

پوماپنکو (Puma Punku) کے مقام پر ہرم کے کھنڈرات میں استعمال ہونے والے بڑے پتھروں کی جسامت اپنے زائرین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔زینے دار ہرم میں ایک تختہ جس کے تلے کی جسامت ۶۰ میٹر (۱۹۷ فٹ) لمبی، پچاس میٹر (۱۶۴ فٹ) چوڑی اور وزن تقریباً چار سو سینتالیس ٹن ہے۔ دوسرے استعمال شدہ پتھروں کے وزن سو اور دو سو ٹن کے درمیان ہیں۔ارباب ارتقا کا یہ دعویٰ غیر منطقی ہے کہ یہ دیوقامت تختے کندوں کے ساتھ موٹی رسیوں کا استعمال کر کے منتقل کیے گئے ہیں۔

ارتقا والے ماہرین آثار قدیمہ ان نشانیوں کی تعبیر بیان نہیں کر سکتے جہاں پر بہت سے بڑے بڑے پتھر پوماپنکو کے مقام پر آپس میں ملا دیے گئے ہیں،ان کو دیکھ کر دھاتی شکنجوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔عرصہ دراز تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ T نما شکنجے استعمال سے

پہلے بھٹی میں ڈالے گئے تھے، اور پھر بلاکوں میں موجود خمدار شگافوں میں ٹھنڈے کر دیے گئے تھے۔ الیکٹرانک خوردبین کے استعمال کے بعد کی تحقیقات نے دکھا دیا کہ ان شگافوں میں یہ پگھلی ہوئی حالت میں ڈالے گئے تھے۔ سپیکٹوگرافی والے تجزیے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ شکنجے دو اعشاریہ صفر پانچ فیصد سنکھیا، پنچانوے اعشاریہ پندرہ فیصد تانبے، صفر اعشاریہ چھبیس فیصد لوہے، صفر اعشاریہ چوراسی فیصد سلیکون اور ایک اعشاریہ سات صفر فیصد قلعی کے بھرت پر مشتمل تھے۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ ماضی کے معاشرے اپنی تعمیر کے دوران پیش رفتہ آلات کا استعمال کیا کرتے تھے۔ ۴۲

دھاتی شکنجے کے باقیات جو پوما پنکو کے مقام پر اکثر و بیشتر ملتے رہتے ہیں۔

اولن تے تمبو (Ollantaytambo) کے تختوں پر دکھائی دینے والے دھاتی شکنجے کی تصویر

کمبوڈیا (Cambodia) میں انگ کوروات (Angkor Wat) کے مقام پر پتھر کی تعمیر دھاتی شکنجے کا نقش

545

مصریوں کے ممی بنانے کے طریقے دکھاتے ہیں کہ ان کے پاس پیش رفتہ طبی علم موجود تھا۔

546

مصری فرعون توتن خامین (Pharaoh Tutankhamen) کا جسم تہ در تہ دو تابوتوں میں محفوظ کیا گیا۔

سمتھ پیپرس بیان کرتا ہے کہ کس طرح قدیم مصریوں نے سوتی کپڑے کی بنی ہوئی پٹیوں کا استعمال کیا۔

547

(۱،۲) بادشاہ کی صدری پر کیا گیا باریک کام جس میں سیم و زر اور نیم قیمتی پتھروں کی دست کاری کی گئی ہے۔

(۳) نفاست سے بنایا گیا چپلوں کا ایک جوڑا۔

(۴) سخت سونے سے بنایا گیا لمبی ٹونٹی والا ایک چھوٹا سا مٹکا جس کی چمک دمک اور سختی تاہنوز برقرار ہے۔

(۵) توتن خامین کی ممی کے گردن میں پایا گیا زیور خوبصورت زرنگاری پر مشتمل ہے نیز اسی ممی میں ایک سو پچاس دوسرے جواہر پائے گئے ہیں۔

(۶) چاندی کی تہ چڑھائی گئی برف گاڑی پر رکھی کی گئی سونے کی لکڑی کی چھاتی۔

(۷) تینس (Tanis) میں دریافت شدہ سونے اور ہیرے جواہرات کی بنائی گئی چھاتی۔

ان زیورات کی نفیس دست کاری دکھاتی ہے کہ اس وقت سناروں والے پیچیدہ آلات استعمال ہوتے تھے۔ ایسے آلات کی غیر موجودگی میں ایسی نفیس دست کاریاں ممکن نہیں تھیں۔ مصری زرنگاری اپنی نفاست وخوبی میں عہد حاضر کے برابر ہے۔

548

مصر کی پیش رفتہ تہذیب کی ایک نشانی ان کی تعمیراتی اور مہندسانہ مہارت ہے۔

549

قدیم مصر میں استعمال ہونے والے سوتی کپڑے کی مثالیں۔

550

دی رِنڈ پیپرس (The Rhind Papyrus)

551

گیزا اہرام کے بارے میں دل فریب حقائق :

گیزا کے مقام پر موجود ہرموں کی تحقیق نے دکھایا ہے کہ قدیم مصری ریاضیات اور جیومیٹری کے اعلیٰ علم سے آراستہ تھے، جیومیٹری اور ریاضیات کے علم کے علاوہ جن لوگوں نے ہرموں کی منصوبہ بندی کی ان کو کرۂ ارض کی پیمائش، اس کی محیط اور اس کے محور کے زاویۂ تمایل کا بھی ضرور علم ہوگا۔ ہرموں کے بارے میں یہ معلومات جن کی تعمیر تقریباً دو ہزار پانچ

سو قبل مسیح میں شروع ہوئی یہ اس وقت مزید دلفریب بن جاتی ہیں جب کوئی یہ غور کرتا ہے کہ وہ عظیم یونانی ریاضی دانوں فیثاغورس، ارشمیدس اور یوکلیڈ سے تقریباً دو ہزار سال پہلے بنائے گئے :

- اہرام عظیم کے زاویے دریائے نیل کی زیریں ہموار علاقے دو برابر حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔
- گیزا کے تین اہرام اس طرح تعمیر کیے گئے ہیں کہ وہ ایک فیثاغورس مثلث بناتے ہیں جن کے اطراف کا تناسب ۳:۴:۵ ہے۔
- اہرام کی اونچائی اور اس کے محیط کے درمیان تناسب ایسا ہی ہے جیسے ایک دائرے کے قطر اور اس کی محیط کے درمیان ہوتا ہے۔
- اہرام عظیم ایک دیوقامت دھوپ گھڑی ہے، نصف اکتوبر اور آغاز مارچ کے درمیان اس سے پڑنے والے سائے سال کی طوالت اور موسموں کی انعکاسی کرتے ہیں۔ اہرام کے اِردگرد پتھر والی سلوں کی لمبائی ایک دن کے سائے کی لمبائی کے متساوی ہے۔
- اہرام کے مربع تلے کی نارمل لمبائی تین سو پینسٹھ اعشاریہ تین دو مصری گزوں (اس دور کی پیمائش کی اکائی) کے برابر ہے۔ یہ عدد شمسی سال (جو تین سو پینسٹھ اعشاریہ تین دو ایام پر مشتمل ہے) میں دنوں کی تعداد کے کافی قریب ہے
- عظیم ہرم اور زمین کے مرکز کے درمیان فاصلہ ہرم اور شمالی قطب کے درمیانی بعد کے متساوی ہے۔
- اہرام میں بنیاد کی محیط اس کی دوگنی لمبائی پر تقسیم کرکے پائی PI کا نمبر آتا ہے۔ اس اہرام کے چاروں اطراف کا سطحی رقبہ اس کی لمبائی کے مربع کے برابر ہے۔ ۵۶

552

چیوپس Cheops (کھوفو) کا عظیم ہرم تقریباً پچیس لاکھ پتھر کے تختوں پر مشتمل ہے، تصور کریں کہ اگر ہر روز مزدوروں کی پوری جدوجہد کے ساتھ دس تختے لگائے جائیں

توان کے لیے چھ سو چوراسی سال کی مدت درکار ہوگی مگر بتایا جاتا ہے کہ ایسے مذکورہ اہرام بنانے کے لیے اوسطاً بیس سے تیس سال لگے۔ یہ سادے سے اعداد وشمار دکھاتے ہیں کہ اہرام بناتے وقت مصریوں نے بالکل مختلف اور اعلیٰ ٹکنالوجی کا استعمال کیا۔

سابقہ معاشروں کی بنائی ہوئی تعمیرات جن میں دیوقامت پتھروں کا استعمال کیا گیا یہ بات دکھاتی ہیں کہ جدید دور میں استعمال ہونے والی مشینری کی طرح آلات ماضی میں بھی ضرور استعمال ہوئے ہوں گے۔سونے کے بنے ہوئے اس مزین برتن کی تعمیری مشینری سے مشابہت چشم تمنائی کے سامان دید ہے-۱۹۲۰ء- میں پاناما میں دریافت شدہ یہ نادرۂ کار لٹکایا جانے والا آویزہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ اور اس قسم کی دریافتیں ارباب ارتقا کے ان دعوؤں کی تردید کرتی ہیں کہ ماضی کے معاشرے مکمل طور پر فرسودہ تھے۔ پوری تاریخ میں علم اور ٹکنالوجی کی نمایاں پیش رفتیں موجود ہیں، تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ ماضی میں لوگ جانوروں کی طرح رہتے تھے۔ماضی کے معاشروں نے اپنی ضرورت کے تحت مشینری استعمال کیں اور مختلف آلات ایجاد کیے۔

عہد قدیم کی درانتی کا ایک نمونہ

اور عہد جدید کی درانتی کا ایک نمونہ

مصری عجائب خانے قاہرہ میں توتن خمین کے شاہی تخت کے پچھلے پینل کی تفصیلات

553

قدیم مصری قبروں سے برآمدہ بے انجن طیارے کا ایک ماڈل

بہت سی تہذیبوں کی چھوڑی ہوئی باقیات دکھاتی ہیں کہ انتہائی قدیم ادوار میں بھی ہوائی نقل وحمل کا انتظام وانصرام تھا۔ یہ مایان کے کھنڈرات اور مصری اہراموں کی تصاویر اور سومری قوم کے کتبوں میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ جہاں تک ہم بتا سکتے ہیں لوگ ہزاروں سال پہلے بے انجن طیاروں، جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کی طرح گاڑیاں بناتے اور ان کو استعمال میں لاتے تھے :

اور سلیمان کے بس میں ہوا کر دی اس کی صبح کی منزل ایک مہینہ کی راہ اور شام کی

منزل ایک مہینہ کی راہ۔(سورۂ سبا؛ ۳۴/۱۲)

یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اس آیت میں جن لمبی مسافتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کو حضرت سلیمان-علیہ السلام- کے دور میں بہت جلدی سے طے کرلیا جاتا تھا۔ جہازوں میں پائی جانے والی ٹکنالوجیوں کی طرح اس نقل وحمل میں ہوا سے چلنے والی گاڑیوں کے استعمال ہوئے ہوں گے۔(واللہ اعلم بالصواب)

مصر میں پایا جانے والا بے انجن طیارہ تہذیب ہائے ماضی میں ہوائی نقل وحمل کے لیے استعمال ہونے کے سلسلہ میں ایک شہادت کا درجہ رکھتا ہے-۱۸۹۸ء- میں دریافت کی گئی اس ماڈل کی تاریخ دوسو قبل مسیح تک بتائی جاتی ہے۔تقریباً دو ہزار دو سو سال پہلے بے انجن کے اس ماڈل کی دریافت یقینا تک قابل ذکر واقعہ ہے۔آثار قدیمہ کی یہ دریافت تاریخ کے بارے میں ارباب ارتقا کے خودساختہ نظریے کی مکمل طور پر تغلیط کرتی ہے، اس سے بھی زیادہ دلچسپ تصویر اس وقت ابھر کر سامنے آتی ہے جب اس ماڈل کے فنی اوصاف کا معاینہ کیا جاتا ہے، اس ماڈل کے لکڑی والے پروں کا تناسب اور اس کی صورت ایسے انداز میں ڈیزائن کی گئی ہے کہ رفتار کی کم سے کم ضیاع کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پرواز بھر سکے-جیسا کہ آج کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ٹکنالوجی کی پیداوار کنکورڈ (Concorde) طیارہ میں ہوتا ہے۔ساتھ ہی یہ بھی دکھاتا ہے کہ قدیم مصری ہوابازی کے آفاقی علم سے بھی آراستہ تھے۔

عقبی منظر

جنبی منظر

بالائی منظر

سطحی منظر

بے انجن طیارے کا ماڈل جو اندازۂ دوسو قبل مسیح کا ہے۔

555

معبد ابی ڈیوس(Abydios) کی دیوار پر ڈاکٹر رت ہائیور(Dr. Ruth

Hiver) کے دریافت کردہ یہاں پر نظر آنے والے آلات آج کی ہیلی کوپٹروں اور جیٹ طیاروں سے کافی حد تک مشابہت رکھتے ہیں۔

554

نزکہ (Nazca) میں دریافت شدہ ہوائی جہاز کا ایک ٹھوس زریں ماڈل :

سابقہ تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے جہاز کے یہ باقیات مصر کے علاوہ اور جگہوں میں بھی پائے گئے ہیں ۔ یہاں پر دکھائے گئے جہاز کا یہ ماڈل جنوب امریکہ کے اسٹیٹ کولمبیا کی ایک غار سے دریافت کیا گیا ہے ۔اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہزار سال پرانا ہے۔اس وقت یہ واشنگٹن ڈی سی کے سمتھ سونین (Smithsonian) ادارے میں موجود ہے۔

اس چھوٹے سے ماڈل کی ہوابازانہ ساخت، دمدار حصے پر پتوار کے کناروں پر ابھرے ہوئے اشکال اور جدید ہوائی جہاز سے کسی بھی لحاظ سے مختلف نہیں ہیں۔ڈولنڈ ای۔ چٹک (Donald E. Chittick) اپنی کتاب ’’The Puzzle of Ancient Man‘‘ (قدیم انسان کا معمہ) میں سونے کے اس ماڈل کی درج ذیل الفاظ میں تشریح کرتا ہے :

> بلاشبہ پیش رفتہ ٹکنالوجی کے علاوہ اس دریافت کے لیے ایک اور تشریح تجویز کرنا ممکن ہے لیکن جب یہ تمام دستی دریافتوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے اور ان کے معانی کی احتیاط کے ساتھ تشخیص کی جاتی ہے تو ایک ہی تشریح ممکن نظر آتی ہے: ان باقیات کا تعلق ایک پیش رفتہ ٹکنالوجی والی تہذیب سے ہے۔☆

☆ ڈولنڈ ای۔ چٹک ۔The Puzzle of Ancient Man کے صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۰۔

ویرا کروز (Vera Cruz) میں پائے جانے والے دوسو قبل مسیح کے اس مجسمہ کی محققین نے آج کے ہوا میں منڈلانے والی گاڑی سے مشابہت دکھائی ہے جسے پانی اور خشکی دونوں پر چلایا جا سکتا ہے۔سائڈ کے گردش کرنے والے حصے ایک دائری حرکت میں گھومتے

ہیں، اوراس کی دم پتوار کا کام کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک حصہ دھواں نکالنے کے لیے ہے ساتھ ہی ایک کنٹرول پینل بھی ہے۔ پائلٹ کا پہنا ہوا لباس اس تقابل کو مکمل کرتا ہے۔

557

کیا ''ڈوگس'' (Dogus) ہزاروں سال پہلے رہنے والے پائلٹوں کی ترجمانی کرتے ہیں :

ڈوگو سات اور تیس سینٹی میٹر (۲۔۸ انچ) تک کی لمبائی والے مٹی کے بنے ہوئے مجسّمے ہیں۔ اس قسم کے اب تک تین ہزار مجسّمے پائے گئے ہیں جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تین سو اور دس ہزار قبل مسیح کے دورانیہ میں بنائے گئے ہیں۔ یہ حقیقت بشمولیت مصر اور سومیر ان کو تمام سابقہ تہذیبوں سے مزید قدیم تر ثابت کرتی ہے۔

ڈوگو کو جومان قبائل نے بنایا جو جاپان کے قدیم ترین باشندے تصور کیے جاتے ہیں۔ تاریخی دستاویزات کے مطابق جومان برتن استعمال کرنے والی پہلی تہذیب تھی☆۔ کیوشو (Kyushu) کے مقام پر موجود فوکوئی (Fukui) غار سے دریافت شدہ برتن کا ایک ٹکڑا بارہ ہزار سات سو سال پرانا ہے۔

ڈوگو کے مجسّمے دوسری گزشتہ تہذیبوں سے بالکل مختلف ہیں۔ جب ہم انتہائی غور و خوض کے ساتھ ان کا معائنہ کرتے ہیں تو ان کے کپڑوں میں اتنا فنی تنوع نظر آتا ہے جو بیسویں صدی کے پہلے ربع میں گہرے سمندر کے غواصوں اور پائلٹوں کے پہنے ہوئے پوشاکوں کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ ڈوگو مجسّموں کی زرہیں مختلف حصوں پر ماہرانہ انداز میں جوڑ دی گئی ہیں تاکہ حرکت کرنے میں آسانی ہو۔ اور سانس لینے کے لیے ان میں سوراخ موجود ہیں۔ آنکھوں کی حفاظت کے لیے خاص قسم کی عینکیں نصب کی گئی ہیں۔ ہاتھوں کو آسانی سے اتارے جانے والے دستانوں سے ڈھانپا گیا ہے۔ خود (Helmet) خصوصی دلچسپ ڈیزائن رکھتی ہے : وہ گول ہے جس میں سانس لینے کا سامان موجود ہیں جو ہیڈ فونز اور نالیوں پر مشتمل ہے۔☆

☆ چھ ہزار سال پرانا خلائی سوٹ، ووغن ایم۔ گرینے، دیباچہ از: زکریا سچن

The six thousand year old space suit, Vaughn M. Greene,

foreword by Zecharia Sitchin

بیسویں صدی کے پروازی اورغواصی سوٹ سے اپنی مشابہت کے لیے قابل ذکر یہ مجسّمے تجویز کرتے ہیں کہ ماضی کے لوگ انتہائی پیش رفتہ ٹکنالوجی سے آراستہ تھے۔ یہ دریافتیں دکھاتی ہیں کہ تاریخ کے دوران ارتقائی سلسلے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے کہ حضرت سلیمان -علیہ السلام- کے دور کی تہذیب ہوائی سفر اور غوطہ خوری میں اعلیٰ درجہ پر فائز تھی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

یہاں پر دو آیتیں ایسی ہیں جن میں جناتوں کا حضرت سلیمان -علیہ السلام- کے لیے غواصی کی خدمات انجام دینے کا تذکرہ ہے :

تو ہم نے ہوا اس کے بس میں کر دی کہ اس کے حکم سے نرم نرم چلتی جہاں وہ چاہتا۔

اور دیو بس میں کر دیے ہر معمار اور غوطہ خور۔ (سورہ ص؛ ۳۸/ ۳۶، ۳۷)

558

دو ہزار سال پرانا غیر عددی کمپیوٹر: ارباب ارتقا کے نظریات کو گڈ مڈ کر دینے والی دریافت

-۱۹۰۰ء- میں جدید علم آثار قدیمہ کی زیر آب مشہور دریافت وہ ڈوبا ہوا جہاز تھا جو کریتے (Crete) اور کائی تیرا (Kythera) کے جزیروں کے درمیان ایجیئن (Aegean) سمندر تک داخل ہونے والے مغربی پنگھٹ پر برآمد ہوا۔ یہ جہاز مجسّموں اور کڑاہوں سے لدا ہوا تھا، جو اب ٹکڑوں کی شکل میں موجود ہیں۔

اکثر باقیات کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ -علیہ السلام- کے دور سے پہلے یونانی فن کاروں کی ایجادات ہیں۔ لیکن ان کے درمیان کیلشیم چڑھا ہوا کانسی کا وہ ٹکڑا بھی تھا جس کی غرض غیر معلوم ہے۔ لیکن سالوں کی تحقیق کے بعد یہ منکشف ہوا کہ یہ پراسرار فن پارہ ایک حیران کن پیچیدہ سائنسی آلہ ہے۔

جیسا کہ یہ دلچسپ آلہ آہستہ آہستہ خشک ہوتا گیا اس کی پرانی لکڑی والی صندوق اور

اس کے اندرونی اجزا میں شگاف پڑتا گیا جو چار ہموار حصوں کو دکھاتی ہے۔ایک گیئر والے پہیے کے اندرونی حصے پر ایک کتبہ پڑا ہوا تھا جو آج کے لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔سائنس دانوں نے تجویز کیا کہ یہ جہاز رانی کا آلہ تھا۔اس چیز کے بارے میں بہت سے نظریات پیش کیے گئے ہیں لیکن کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ۱۹۵۱ء۔ میں یالے(Yale)یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیرک جے۔ڈی سولیا پرائس (professor Derek J. de Solla Price) کی تحقیق تک اس کی بابت قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

اس آلے کو دوبارہ بنانے کی غرض سے پرائس اور اس کے یونانی رفقاے کار نے گاما اور ایکس شعاعوں سے اس پر بمباری کرکے تحقیق کی۔انھوں نے ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے مختلف جسامت کے گیئروں کی تہیں اس آلے کے اندر دریافت کیں،ان گیئروں کی باہمی مناسبت کے طویل اعداد و شمار کے بعد پرائس اس دل فریب نتیجہ پر پہنچا :

قدیم یونانیوں نے اپنے ماضی، حال اور مستقبل میں سورج چانداور دیگر سیاروں کی حقیقی حرکتوں کی نقل کے لیے ایک آلہ ایجادکیا۔یہ ’’اینٹی کائترا‘‘(Antikythera)نامی آلہ دو ہزار سال پرانا اینالوگ کمپیوٹر تھا۔ا

اس دریافت نے ارباب ارتقا کے ان دعوؤں کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے کہ ابتدائی آلات کی ایجاد اور ان کا استعمال ہیلینسٹک (Hellenistic)دور سے پہلے ہوئی۔

یہ بنیادی طور پر مستطیل چوبدار صندوق کے اندر موجود کانسی کا ایک آلہ تھا ،اگلے اور پچھلے حصہ پر کانسی کے ڈھکنے تھے،جن پر ان کے موجد دست کار نے تفصیلی معلومات کندہ کی تھیں۔اس آلے کی پیدا کردہ معلومات کو پڑھنے کے لیے تین ڈائل تھے پہلا دو پیمانوں پر مشتمل تھا جن میں سے ایک برجوں کی علامات کو دکھاتا اور دوسرا سال کے مہینوں کے لیے یونانی ناموں کے ساتھ کندہ کیا گیا تھا☆

پہلا ڈائل سال کے ہر روز میں سورج کے برجوں سے گزرتے ہوئے مقامات کو دکھاتا تھا☆

دوسرا ڈائل شمسی گرہنوں کے اٹھارہ سالہ چکر کو دکھاتا تھا☆

تیسرا ڈائل چاند کے مختلف مراحل کو دکھاتا تھا☆

ایک دستے کے ذریعہ اس کو توانائی فراہم کی جاتی تھی ، جس کو ہرروز ایک بار گھمانا ناگزیر تھا تاکہ تقریباً اٹھتالیس کانسی کے گیئروں کو گھمایا جاسکے جو ایک متوازی چپٹی سطح پر سلسلہ وار بچھائے گئے تھے۔ یہ ایک چلانے والے پہیے کو گھماتا تھا جو گیئروں کے دوسلسلوں کے ساتھ مربوط تھا، جو ایک چپٹی سطح والے گول دندانے دار حصے کے ذریعہ آپس میں مربوط تھے، چپٹی سطح والا گول حصہ امتیازی گیئر کے طور پر کام کرتا تھا اور جب توانائی دینے والے دستے کو گھمایا جاتا تو دودُرّیں مختلف رفتاروں کے ساتھ گھومتے تھے، امتیازی گیئر جو آج کل کے جدید گاڑیوں میں استعمال ہوتے ہیں اور جو موڑوں پر مختلف رفتاروں کے ساتھ ٹائروں کو گردش کا موقع دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ سترہویں صدی میں ایجاد ہو چکا تھا۔ پرائس نے اس آلے کو ''تمام ادوار کے لیے میکینکل ایجادات کا عظیم ترین سرچشمہ '' قرار دیا ہے۔ ۲

اس دریافت نے پوری دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کردی۔ اس کے ساتھ ارباب ارتقا کی ''فنی ارتقا'' والی جھوٹی سازشیں بری طرح متاثر ہوگئیں۔ ارباب ارتقا کے مطابق دوہزار سال پرانی کسی بھی تہذیب کے پاس کسی قسم کی پیچیدہ ٹکنالوجی موجود نہیں ہونی چاہیے اور انھوں نے محض سادہ اوزار کا استعمال کیا ہوگا۔ تاہم قدیم یونانیوں کے ایجادہ کردہ اس آلے نے دکھادیا کہ ماضی کی تہذیبیں ارباب ارتقا کے خیال کے مطابق نہیں تھیں انھوں نے صدیوں پہلے ایک فلکیاتی کمپیوٹر ایجاد کیا۔ اور قرون وسطیٰ کی کئی تہذیبوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ (پہلا انالوگ کمپیوٹر وینے واربش (Vannevar Bush) نے ۱۹۳۱ء میں ایجاد کیا)۔ ۳

ڈونالڈ ای چٹک اپنی کتاب **The Puzzle of Ancient Man: Advanced Technology in Past Civilizations?** درج ذیل تبصرہ کرتا ہے :

عیسیٰ- علیہ السلام- کے عہد سے پہلے آیجیئن سمندر میں غرق اس جہاز سے

برآمدہ شے شاید اس سے بھی زیادہ حیران کن ہے یہ ایک قسم کا حساب کرنے والا مشینیا آلہ معلوم ہوتا تھا۔ جدید کمپیوٹر دو قسموں کے ہیں۔ اینالوگ اور ڈیجیٹل۔ حضرت عیسیٰ-علیہ السلام- کے عہد سے پہلے غرق شدہ اس جہاز سے برآمدہ شے نہایت پیچیدہ انالوگ کمپیوٹر تھا۔ ۴

ہیلینا سمتھ (Helena Smith) کا ابزرور (Observer) میں محررہ اس دریافت کی بابت ایک مقالے کا عنوان یہ تھا '' Revealed: World's Oldest Computer'' (دنیا کے قدیم ترین کمپیوٹر کی بازیافت) اس کے مقالے سے لیا گیا اقتباس درج ذیل ہے :

۔۔۔کیلشیم کی تہ چڑھے ہوے کانسی کے اس آلہ کی تہِ سمندر سے ملنے کے بعد اس پر مخفی کندہ کاریاں دکھاتی ہیں کہ یہ دنیا کا سب سے قدیم ترین کمپیوٹر ہے جو سورج، چاند اور سیاروں کی حرکات کے نقشوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ 'ہم اس عقدے کی گرہ کشائی کرنے ہی والے ہیں'۔ انگلستانی اور یونانی ماہرین کی ایک ٹیم کی معیت میں اس آلے پر تحقیق کرنے والا ماہر فلکی طبعیات زینوفون (Xenophon) موسس کہتا ہے۔ 'یہ فلکیاتی اور ریاضیاتی علم سے متعلق ایک معمے کی طرح ہے'۔۔۔ لندن کے سائنسی میوزیم کا سابقہ نگراں مائیکل رائٹ ۔۔۔نے کہا۔ یہ آلہ اس بات کا بہترین ثبوت ہے کہ قدیم دور کے لوگ ٹکنالوجی میں کس حد تک ترقی یافتہ تھے۔ 'اس کی بناوٹ کا ماہرانہ انداز نشاۃ ثانیہ تک سبقت نہ لینے والے آلات بنانے کے اس درجے کو دکھاتا ہے'۔

۔۔۔بہت سے ماہرین نے کہا ہے کہ یہ سائنس کی تحریر شدہ تاریخ کی قسمت بدل سکتی ہے۔ 'گوناگوں اوصاف کے اعتبار سے یہ پہلا اینالوگ کمپیوٹر تھا'۔ نیشنل ٹیکنکل یونیورسٹی کے پروفیسر تھیوڈوسیس ہتسویس (Professor Theodosios Tassios) نے یہ بات کہی۔ 'یہ اس انداز کو بدل دے گا جس سے ہم قدیم لوگوں کے فنی کارہائے نمایاں کا مشاہدہ کرتے ہیں'۔ ۵

ماہرین کے یہ بیانات نہایت اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ اینٹی کائترا (Antikythera) آلے کے مشابہ کمپیوٹر بنانے کے لیے انسانوں کو تقریباً بیس صدیاں لگیں۔ دو ہزار سال قبل یونانی اینالوگ کمپیوٹر بنانے کے علم سے آراستہ تھے۔ یہ سب کچھ ہمیں دکھاتا ہے کہ بہت پہلے رہنے والے لوگوں کے پاس بعد کے کئی معاشروں سے اعلیٰ تر تہذیب وثقافت موجود تھی، یہ وہ حقیقت ہے جس کی تشریح ارتقا سے نہیں کی جا سکتی۔

جس وقت یونانی اپنے پیش رفتہ تہذیب سے لطف اندوز ہو رہے تھے اس وقت دنیا کے کئی علاقوں میں پس ماندہ تہذیبیں موجود تھیں یہ حقیقت کہ بعض معاشرے ایک پیش رفتہ حالت میں میں موجود تھے جب کہ دوسرے کم ترقی یافتہ تھے اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ انسان ایک ایسا جنس ہے جو بندروں سے ارتقا کر کے آیا ہے۔ یا ایک معاشرہ دوسرے سے ترقی کر کے آیا جیسا کہ ڈارونسٹ دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ سائنسی اور منطقی حقائق کے برعکس مبنی بر جہالت تعبیر ہے۔

۱۔ اس پتے پر دیکھا جا سکتا ہے:

http://www.dreamscape.com/morgana/triton2.htm

۲۔ ایضاً۔

۳۔ اس پتے پر دیکھا جا سکتا ہے :

Encyclopaedia Britannica Online; www.britannica.com/eb/ article-9018261/Vannevar-Bush

۴۔ ڈونالڈ ای۔ چٹک، The Puzzle of Ancient Man: Advanced Technology in Past Civilizations?, کریشن کمپاس، ۱۹۹۸ء، صفحہ: ۳۴ تا ۳۵

۵۔ ہیلینا اسمتھ، دنیا کے قدیم ترین کمپیوٹر کی بازیافت، آبزرور، ۲۰ راگست ۲۰۰۶ء۔ اس پتے پر دیکھیں :

http://observer.guardian.co.uk/world/story/0,,1854232,00.html

یہاں پر دکھائی گئی تصویر میں ایجیئن سمندر سے برآمدہ گیئر والا پہیا قدیم کمپیوٹر کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔

560

کیا قدیم یونان میں بجلی کا کوئی وجود تھا؟

دندیرا(Dendera) کے مقام پر معبد ہاتھور کے نقوش نے اس امکان کو ظاہر کیا ہے کہ قدیم مصری بجلی کی پیداوار اور اس کے طریقہ استعمال پر مطلع تھے۔اس نقش میں دیے گئے تصاویر کا جب غور سے جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج کی طرح زیادہ وولٹ والی حجر اس وقت بھی استعمال ہوئی ہوگی: ایک بلب نما صورت جسے ایک ایسے مستطیل ستون کا سہارا حاصل ہےجس کو جد ستون کہا جاتا ہے اور اس کو حاجز تصور کیا جاتا ہے۔تصویر میں اس شکل اور بجلی کے بلب کے درمیان مشابہت حیران کن ہے۔۵۸

بجلی کے بلب کے ٹنگسٹن والے تار کے موجد ڈاکٹر کولن جی۔فنک کو ۱۹۳۳ء-میں قدیم مصری دھاتی ظروف کا تجزیہ کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ اہل مصر کوئی چار ہزار تین سو سال قبل ہی سے تانبے پر سرمے کی تہ چڑھانے کے طریقے سے باخبر تھے۔یہ وہی طریقہ تھا جس کے ذریعہ کچھ ایسے ہی نتائج آج کے برقی پاشیدگی سے حاصل کی جاتی ہے۔۵۹

سائنس دانوں نے ان ابھرے ہوئے نقوش میں دکھائے گئے نظام کا تجربہ کیا ہے تا کہ یہ متعین کرسکیں کہ یہ روشنی دینے کے قابل ہے یانہیں۔آسٹریا کا الیکٹریکل انجینئر والٹرگارن (Walter Garn) نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان نقوش کا مطالعہ کیا اورجد ستون والا حاجز، بلب اور مڑا ہوا تار از سر نو بنایا۔اس کے تیارہ کردہ ماڈل نے یقینا کام کیااور روشنی پھیلائی۔۶۰

قدیم اہل مصر کے بجلی استعمال کرنے کی ایک دوسری شہادت یہ ہے کہ ان کے مقبروں اوراہراموں کی اندرونی دیواروں پر کسی داغ ودھبے کے آثارنظرنہیں آتے۔ارتقائی نظریات کے حامی ماہرین آثارقدیمہ دعویٰ کرتے ہیں اگر وہ مشعلوں کو جلاتے اور تیل کے چراغوں کوروشنی کے لیے استعمال کرتے،تو پھرلازمی طور پران درودیوار پرداغ دھبوں کے اثرات باقی رہ جاتے،مگراس طرح کی کوئی نشانی کہیں نہیں ملتی یہاں تک کہ عمیق ترین کمروں میں بھی۔ضروری روشنی کا سامان کیے بغیر تعمیرات کاتسلسل برقرارنہیں رکھا جاسکتا تھا۔اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ دیواروں پر باریک ترین اورعالی شان تصویروں کی رنگ سازی ممکن نہ ہوئی ہوتی۔یہ اس امکان کوقوی تر بنادیتا ہے کہ یقینا قدیم مصر میں بجلی کا استعمال ضرور رہا ہوگا۔

دندیرا کے مقام پر معبد ہاثور کے ان نقوش میں تصاویر کا آج کے روشنی کے بلبوں سے مشابہت نے سائنس دانوں کوورطہ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

اہل مصر کے تصویر کشیوں میں اکثر دکھائے گئے جدستون بجلی کے ایک آلے کی نشانی ہوسکتی ہے۔اور کھمبے نے روشنی فراہم کرنے والے جنریٹر کا کام کیا ہوگا۔

561

فلپ جانسن (**Phillip Johnson**)

562

تین ہزارقبل مسیح سے بھی پہلے سومری قبائل نے وسیع علاقوں میں مستقل طور پر بڑے شہروں والی ریاست بنا کر اپنے کنٹرول میں لایا۔

قدیم معاشروں کی آباد کردہ گہری جڑوں والی تہذیبیں دکھاتی ہیں کہ "فرسودہ سے مہذب کی طرف ارتقا" کا نظریۂ ڈارون حقائق کی عکاسی نہیں کرتا۔ سومری تہذیب اس کی ایک بہترین مثال ہے۔

563

اوپر والی تصویر میں اسیریوں کا رَتھ کسی قوت سائقہ کے بغیر جس انداز میں حرکت کرتا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ فوجیوں کی زرہیں دکھاتی ہیں کہ اس وقت کی دھات کاری کا فن کتنا پیش رفتہ تھا۔ ان کا زرہ بند پوشاک ایسے سلیقے سے تیار کیا گیا تھا کہ وہ آسانی کے ساتھ حرکت کر سکتے تھے، جب کہ وہ سر سے پاؤں تک محفوظ تھے۔ رَتھ کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ جنگی حالات اور شدید ضربوں کا سامنا کر سکے، اس لیے کہ اس کو قلعہ شکن گرز کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ رتھ کے بنانے میں استعمال شدہ مواد اور قوتِ مزاحمت خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ (دو ہزار قبل مسیح سے لے کر چھ سو بارہ قبل مسیح تک)

564

اپنے مشاہدات کی بنیاد پر سومریوں نے شمسی نظام کو بشمول مہ وخورشید بارہ سیاروں سے بنا ہوا تصور کیا۔ ان کا بارہواں سیارہ جس کا بعض حوالوں میں نیبیرو (Nibiru) کے نام سے تذکرہ ملتا ہے وہ درحقیقت دسواں سیارہ ہے جو سیارہ دہم کے نام سے مشہور ہے جس کا وجود اکثر سائنس دانوں نے حالیہ دور میں مان لیا ہے۔

سیارچے والا بیلٹ

مریخ

چاند

زمین

عطارد

زہرہ

پلوٹو

نیپ چون
سورج
مشتری
زحل
یورینس

اوپر والی تصویر شمسی نظام کی سومیری خاکوں کو دکھاتی ہے۔سورج درمیان میں نظر آتا ہے اور سیارے اس کے ارد گرد گھومتے ہیں۔

565

سومری بارہ مہینوں والی جنتری کا استعمال کرتے تھے۔ستاروں کے کئی جھرمٹوں کے نقشے کھینچے۔عطارد، زہرہ اور مشتری جیسے سیاروں کی حرکات کا تعاقب کیا۔ہمارے دور میں کیے گئے کمپیوٹر کے اعداد و شمار اور دریافتوں نے ان کی باریکی صحت کی تصدیق کی ہے۔

ذی غرات
نمرود کا عدسہ

-۱۸۵۰ء- میں ماہر آثار قدیمہ سر جان لیارڈ(Sir John Layard) کے ذریعہ کی گئی ایک دریافت نے یہ سوال اٹھایا کہ واقعتا پہلی بار عدسے کا استعمال کس نے کیا۔آج عراق کے نام سے مشہور علاقوں میں کھدائیوں کے سلسلے کے دوران لیرڈ نے تین ہزار سال پرانا عدسے کا ایک ٹکڑا دریافت کیا۔حال ہی میں برٹش کے عجائب گھر میں نمائش کے لیے موجود یہ ٹکڑا دکھاتا ہے کہ پہلا مشہور عدسہ اسیریوں کے دور میں استعمال کیا گیا۔روم کی یونیورسٹی کا پروفیسر جیوانی پیٹی ناٹو (Professor Giovanni Pettinato) یقین رکھتا ہے کہ چمکدار پتھر والا یہ عدسہ سائنس کی تاریخ پر ازسرنو غور کرنے کی ایک بڑی دریافت ہے۔اس چمکدار عدسہ سے یہ بات بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ فلکیات کے بارے میں سیارہ زحل اور اس کے گرد دائروں کی دریافت کرنے والے قدیم اسیریوں کا دائرہ معلومات کتنا وسیع رہا ہوگا۔٦٦

یہ سوال زیر بحث آ سکتا ہے کہ کس مقصد کے لیے اس عدسے کو استعمال کیا گیا لیکن یہ اب تک واضح ہے کہ گزشتہ معاشروں میں سے کوئی بھی سادہ زندگی نہیں بسر کر رہا تھا جیسا کہ ارتقا والے سائنس داں دعویٰ کرتے ہیں۔ سابقہ معاشروں نے ٹکنالوجی اور سائنس کا استعمال کیا، گہری جڑوں والی تہذیبیں بنائیں اور ترقی یافتہ طرزِ زندگی سے لطف اندوز ہوئے۔ ان کی روزمرہ زندگی کے بارے میں محض محدود معلومات ہم تک پہنچی ہیں لیکن عملی طور پر ہماری معلومات بتاتی ہیں کہ ان معاشروں میں سے کوئی بھی ارتقائی عمل سے کبھی نہیں گزرا ہے۔

تقریباً تین ہزار سال پرانے عدسے جیسے ٹکڑے کو ایک اہم دریافت قرار دیا گیا ہے جو ''سائنس کی تاریخ پر از سرِ نو غور کرنے کی دعوت دیتا ہے''۔ تاریخ دکھاتی ہے کہ انسان روزِ اول ہی سے ایک انسان جیسی ذہنیت، صلاحیت اور ذوق رکھتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں بغداد والی بیٹری کے نام سے جرمن ماہر آثار قدیمہ ویلہیم کونگ (Wilhelm Konig) نے ایک گلدان نما برتن دریافت کیا جو آج ''بغداد کی بیٹری'' کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن یہ نتیجہ کیسے نکالا گیا کہ تقریبا دو ہزار سال پرانا یہ برتن بیٹری کے طور پر استعمال کیا گیا تھا؟ اگر تازہ تحقیقیں یقینی طور پر یہ دکھاتی ہیں کہ اسے واقعتا ایک بیٹری کے طور پر استعمال کیا گیا تھا، پھر تو وہ تمام نظریے مکمل طور پر تہس نہس ہو جائیں گے جو یہ بتاتے ہیں کہ فرسودہ حالات کے تحت ماضی میں زندگی گزارنے والے معاشرے اور تہذیبیں ہمیشہ ترقی کرتی آئی ہیں۔

اسفالٹ یا بیٹومین میں سیل کیے گئے مٹی کے اس برتن میں تانبے کا ایک سلنڈر رہے۔ اس سلنڈر کی تہ تانبے کے ایک قرص سے ڈھانپ دی گئی ہے۔ سلنڈر کو چھوئے بغیر اس کے اندر آویزاں لوہے کی ایک سلاخ کو اسفالٹ والے کاک نے سہارا دے رکھا ہے۔

اگر یہ برتن کسی برق پاش مادے سے بھر دیا جائے تو نتیجۃً کرنٹ پیدا کرنے والی بیٹری بن جاتی ہے۔ یہ مظہر الیکٹروکیمیکل ردعمل کے طور پر متعارف ہے اور اس طریقے سے زیادہ مختلف نہیں ہے جو آج کل کی بیٹریوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تجربات کے دوران بغداد والی بیٹری کی اساس پر بعض از سرِ نو بناوٹوں کے ذریعہ ایک اعشاریہ پانچ اور دو

وولٹ کے درمیان بجلی پیدا کی گئی۔

یہ ایک اہم سوال کو جنم دیتا ہے کہ دو ہزار سال قبل یہ بیٹری کس لیے استعمال کی گئی چوں کہ جب ایسی بیٹری کا وجود تھا تو ظاہری طور پر ایسے اوزار اور آلات بھی ضرور رہے ہوں گے جن کو یہ توانائی فراہم کرتی تھی۔ یہ بات ایک دفعہ پھر دکھاتی ہے کہ ارباب ارتقا کے پہلے دور کی بابت نظریات بالکل بے سرو پا ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ دو ہزار سال قبل رہنے والے لوگ بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ ٹکنالوجی اور اعلیٰ معیارِ زندگی کے مالک تھے۔

اسفالٹ والا کاگ

تانبے والا سلنڈر

لوہے کا سلاخ

برق پاشیدہ محلول

دو ہزار سال پرانے ''بغداد والی بیٹری'' کے نام سے مشہور اس برتن پر تحقیق تجویز کرتی ہے کہ اس کو بجلی پیدا کرنے کے لیے بیٹری کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

568

اکسمال (Uxmal) کے قدیم مایان شہر میں تعمیر کے باقیات۔

ارتقا والے بعض سائنس دان دعویٰ کرتے ہیں کہ اہل مایان نے دھاتی اوزار کا استعمال نہیں کیا لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ہم مایان کے کھنڈرات میں پتھر کے نفیس کام کی کیا توجیہ پیش کر سکتے ہیں؟ یوکاتان (Yucatan) بارانی جنگل کی مرطوب آب وہوا کی وجہ سے دھاتی اوزار بہت جلد زنگ آلود ہو کر سڑ گل جاتے ہیں، تو یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ مایان کے دھاتی اوزار ہمارے دور تک باقی نہیں رہ سکے۔ لیکن ان کے بعد باقی رہ جانے والی پتھر کی عمارتیں دکھاتی ہیں کہ محض پتھر کا استعمال کر کے ایسے نفیس اور تفصیلی کام سرانجام دینا ناممکن ہے۔

569

از سرِ نو تعمیر شدہ معبد روسالیلا (Rosalila Temple) کا بالائی حصہ

پتھروں پر تفصیلی کندہ کاری دکھاتی ہے کہ اہل مایان کے پاس پتھر کی تعمیرات کے لیے ضروری ٹکنالوجی موجود تھی۔ اور اسٹیل کی ریتیوں، چھنیوں اور برموں جیسے آلات کی عدم موجودگی میں ایسا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

مایان کی جنتری آج استعمال ہونے والی تین سو پینسٹھ دنوں والی گریگورین کیلنڈر کے تقریباً مشابہ ہے۔ مایان نے سال کا ۳۶۵ دنوں سے ذرا سا لمبا حساب کیا ہے۔ (دائیں) آسٹک جنتری والا پتھر (بالا)

570

چیچن اتزا (Chichen Itza) کے مقام پر معبد جنگجو

فلکیات کے ایک ایسے علم سے بہرہ مندی جس میں حساب لگا کر ہر چھ ہزار سال میں زہرہ کے مدار سے ایک ایک دن کی تفریق ضروری ہوتی ہے، سابقہ لوگوں کی ترقیوں کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔

571

زیریں۔ مایان کے حکمراں پاکل (Pacal) کے مرگھٹ کے گرد تابوتی چادر کی تفصیل

پاکل جس گاڑی پر سوار ہے وہ موٹر سائیکل کی قسم سے مشابہ ہے جو اس وقت کی کسی توانائی سے چلنے والی گاڑی ہو سکتی ہے۔

572

بغیر کسی سائنسی ثبوت کے ڈارونسٹ دعویٰ کرتے ہیں کہ قدیم انسان فرسودہ حالات میں زندگی گزارنے والے فرسودہ مخلوق تھے اور یہ کہ ان کی ذہانت وقت کی گزر کے ساتھ ترقی پذیر ہوتی رہی۔ تاہم آثارِ قدیمہ کی دریافتیں اس کی تردید کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر تکال کے قدیم شہر مایان میں کی گئی کھدائیاں انجینئرنگ اور منصوبہ بندی کے عجوبے کا سماں پیش کرتی ہیں۔ فضا سے لی گئی تصاویر دکھاتی ہے کہ مایان شہر سڑکوں کے ایک وسیع جال کے ذریعہ ایک دوسرے سے مربوط تھے۔ یہ سب کچھ ظاہر کرتا ہے کہ تاریخ کے تمام ادوار میں پیش رفتہ

تہذیبیں موجود رہی ہیں۔

کوپن (Copan) میں مایان کے دندانے دار پہیے

574

نزکا (Nazca) لکیریں، اک معمہ ہیں سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

لائما (Lima) کے پیرووِیان (Peruvian) شہر کے باہر نزکا کی لکیریں ایک ایسی دریافت ہیں جس کی تشریح سے سائنس دان قاصر ہیں۔ یہ انتہائی حیران کن لکیریں ۱۹۳۹ء میں نیویارک کی لانگ آئلنڈ یونیورسٹی کے ڈاکٹر پال کوسوک (Dr. Paul Kosok) کے فضائی مطالعات کے نتیجے میں منکشف ہوئیں۔ چند کلومیٹر لمبی یہ لکیریں بعض اوقات ایک ہوائی اڈے میں طیارے کی سڑک سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں، نیز مختلف پرندوں، بندروں اور مکڑیوں کو بھی دکھاتی ہیں۔ کیوں، کیسے اور کس نے پیرووِیان کے بے آب وگیاہ صحرا میں یہ لکیریں کھینچیں، یہ اب تک ایک معمہ ہے۔ دوسری طرف جس نے بھی ان کو بنایا تو یقینی طور پر اسے فرسودہ زندگی کا حامل نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ بعض سائنس داں دعویٰ کرتے ہیں۔ فضا سے واضح طور پر نظر آنے والے یہ خطوط بغیر کسی نقص کے بنائے گئے ہیں جو کہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے جس پر کافی غور وخوض کی ضرورت ہے۔

۱۔ پینتالیس میٹر (۱۵۰ رفٹ) لمبی مکڑی کی تصویر
۲۔ ایک انسانی مجسمہ
۳۔ ایک سو چالیس میٹر (۴۵۰ رفٹ) لمبے گدھ کا نمونہ
۴۔ بندر کی ایک بڑی تصویر اٹھاون میٹر (۱۹۰ رفٹ) چوڑی اور ترانوے (۳۰۵ رفٹ) لمبی
۵۔ درخت اور شاخوں کی تصویریں
۶۔ کتے کی تصویر

پوری تاریخ کے دوران سائنس اور ٹکنالوجی کی پیش رفتگی کے ساتھ ساتھ دوسرے میدانوں میں بھی خاطر خواہ ترقیاں ہوئی ہیں، لیکن یہ بیان غیر منطقی اور غیر سائنسی ہے کہ ان

تبدیلیوں کو مادہ پرستوں کی طرح ارتقا کے نام سے موسوم کیا جائے۔ثقافتی اور علمی ترقی کی بدولت سائنس اور ٹکنالوجی جیسے میدانوں میں مسلسل پیش رفتیں ہوتی رہی ہیں۔ یہ بات ڈھنکے کی چوٹ پر کہی جاسکتی ہے کہ آج کے انسانوں اور ہزاروں سال پہلے رہنے والے انسانوں میں کسی قسم کا کوئی طبعی اور جسمانی امتیاز نہیں اور نہ ہی ان کی ذہانت وصلاحیت میں کوئی تفاوت ہے۔ یہ نظریہ ارباب ارتقا کا چھوڑا ہوا ایک غلط شوشہ اور فاسد پس منظر ہے کہ بیسویں صدی کے لوگ زیادہ پیش رفتہ تہذیبوں کے مالک ہیں کیوں کہ ان کی ذہنی صلاحیت بڑھ گئی ہے۔

576

دنیا میں موجود بہت سی نسلیں متعدد زبانیں بولتی ہیں اور ہر زبان انتہائی پیچیدہ ہے۔ ارباب ارتقا یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس قسم کی پیچیدگی کس طرح آہستہ آہستہ وجود میں آئی ہوگی۔

577

رچرڈ ڈاؤکنز(Richard Dawkins)

نوعم چومسکی(Noam Chomsky)

579

چارلس ڈارون(Charles Darwin)

تاریخی شہادتیں بتاتی ہیں کہ بعض ادوار میں سورج پرست لوگ موجود رہے ہیں،اور آج بھی جدید حالات کے تحت زندگی گزارنے والے لوگوں میں ایسے باطل عقائد جڑ پکڑے ہوئے ہیں۔ یہ بات دکھاتی ہے کہ ایسے لوگ درحقیقت بگڑے ہوئے عقیدہ کے حامل کفار ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فرسودہ ہیں۔

580

سائیڈ والی تصویر سومریوں کے ایک جھوٹے خدا ''خداے رعد'' کو دکھاتی ہے، جو ایک سچے الہامی عقیدے میں بگاڑ کے بعد ظاہر ہوا۔

جب سومریوں کے کتبوں کا ترجمہ کیا گیا تو یہ بات آشکار ہوئی کہ بابل کے مشہور ومعروف جھوٹے خداؤں کا ایک انبوہِ کثیر ایک ہی خدا کے مختلف ناموں اور خطابات کی درجہ بدرجہ غلط تعبیر کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آیا۔

بابل کے مشہور دیوتاؤں میں سے مردوک نامی جھوٹا دیوتا

581

اخیناتین (Akhenaten) نامی فرعون خدائے واحد پر عقیدہ رکھتا تھا اور اس نے تمام بتوں کو تاخت وتاراج کر دیا تھا۔ اس نے اپنے عقیدے کا اظہار حمد کے ان الفاظ میں کیا :

> تیرے کارنامے بہت ہیں گرچہ تو نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اے خدائے وحدہ لاشریک تو نے زمین کو اپنی مشیت کے مطابق بنایا، اور تیری ذات واحد نے انسانوں اور چرند و پرند کو پیدا کیا۔ اور وہ تو ہی ہے جس نے زمین پر پاؤں کے بل چلنے اور پروں سے ہواؤں میں اونچی اڑان بھرنے والی تمام مخلوق کو نیست سے ہست کیا۔۔۔

بشریاتی تحقیق دکھاتی ہے کہ عقیدۂ توحید کے بگاڑ کے بعد مشرکانہ عقائد معرضِ وجود میں آئے۔ یہ ایک ثبوت ہے کہ مذہبی ''ارتقا'' کا کوئی عمل کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا جیسا کہ ہم سے عقیدہ رکھنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

582

ہندوؤں کا اوہام پرستانہ مذہب بہت سے جھوٹے خداؤں سے بھرا پڑا ہے۔ تاہم تحقیق دکھاتی ہے کہ ہندو ثقافت کے حامل لوگ آغاز میں خدائے واحد پر یقین رکھتے تھے۔

583

قدیم یونانی مذہبی عقیدوں پر تحقیق کرنے والا اکسل ڈبلیو۔ پرسن (Axel W. Persson) اپنی کتاب ''The Religion of Greece in Prehistoric Times'' میں رقم طراز ہے :

۔۔۔بعد میں کم وبیش اہمیت والے اشخاص کی تعداد ابھر کر آئی جن سے یونانی مذہبی قصوں میں ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔

585

وقت کا تصور ہمارے ذہنوں میں مختلف اوہام کے تقابل کی حیثیت سے رہتا ہے۔ اگر کسی انسان کی یادداشت نہ ہوتو وہ اپنے ذہن میں ایسا تجزیہ نہیں کرسکتا۔اس لیے وہ وقت کا کوئی تصور نہیں کرسکتا۔اگر لوگوں کی یادداشتیں نہ ہوں تو وہ ماضی کے کسی دور کے بارے میں سوچ نہیں سکتے۔اور محض اسی ''لمحے'' کو محسوس کر سکتے ہیں جس میں وہ رہ رہے ہیں۔

587

دوسری جنگ عظیم کا آغاز واختتام، خلا میں پہلی راکٹ کی روانگی، قدیم مصری اہرام کی تعمیر میں پہلا پتھر نصب کرنا، اوراسٹون ہنج کے مقام پر کئی ٹن وزن والے پتھروں کا کھڑا کرنا، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ایک لمحے اور واقعہ کی حیثیت سے رہتے ہیں۔

ماخذ و مراجع
Notes

۱۔ ریچرڈ لیکی، The Origin of Humankind (Science Masters Series)، (انسانوں کی ابتدا، سائنسی ماسٹرز سیریز)، نیویارک بیسک بوکس۔ ۱۹۹۴ء۔ صفحہ: ۱۲۔

۲۔ ایل۔ ایس۔ بی۔ لیکی، Adam's Ancestors: The Evolution of Man and His Culture (بنی آدم کے آباؤاجداد: انسان اور اس کی تہذیب کا انقلاب)، نیویارک اینڈ ایونسٹن: ہارپر اینڈ رو، پبلشرز، اڈیشن چہارم ۱۹۶۰ء۔ صفحہ: ۹ تا ۱۰۔

۳۔ ابرام کارڈینز، سائنسی امریکی میں موجود "Posthumous Essays by Branislau Malinowski," (قصہ ہائے پس از مرگ: مصنفہ: برانسلاؤ ملینوسکی) سے ماخوز اقتباس، جون۔ ۱۹۱۸ء۔ صفحہ: ۵۸۔

۴۔ میلویلے ہرسکوویٹس، Man and His Works (انسان اور اس کی کارکردگیاں)، نیویارک، کنوپف۔ ۱۹۵۰ء۔ صفحہ: ۴۶۷۔

۵۔ ایضا: صفحہ: ۴۷۶۔

۶۔ ایڈورڈ اگسٹس فری مین، "Race and Language," in Essays (نسل اور زبان)۔ انگلستانی نیز امریکی انشائیوں میں مقدموں، حواشی اور تشریحات کے ساتھ۔ نیویارک، پی۔ ایف۔ کولیر اینڈ سنس [سی ۱۹۱۰] ہارورڈ کلاسیکس، نمبر: ۲۸۔

۷۔ احمد تومسن، Making History (تاریخ سازی)، لندن، طہ پبلشرز لمٹیڈ، ۔ ۱۹۹۷ء۔ صفحہ: ۴۔

۸۔ زیچ زورکھ، "Did Homo erectus Coddle His Grandparents?," (کیا عہد قدیم میں اپنے آباؤ اجداد کی دیکھ بھال انسان کرتا تھا یا نہیں؟)، دریافت، جلد ۲۷۔ نمبر۔ ۱۔ جنوری۔ ۲۰۰۶ء۔ صفحہ: ۶۷۔

۹۔ روگر لیون، The Origin of Modern Humans (جدید انسانوں کا مبدأ)، نیو یارک: ڈبلیو۔ایچ۔فری مین اینڈ کمپنی، ۱۹۹۳ء، صفحہ: ۱۱۶۔

۱۰۔ کلیر وامبر، "Ape-Man: Origin of Sophistication," (بندر نما انسان: پیچیدگی کا منبع)، بی بی سی نیوز، ۲۲ر فروری ۲۰۰۰ء، انٹرنیٹ پر اس پتے پر دیکھا جا سکتا ہے:

http://news.bbc.co.uk/1/hi/sci/tech/650095.stm

۱۱: لیون، The Origin of Modern Humans (جدید انسانوں کا مبدأ)، صفحہ: ۱۴۸ تا ۱۴۹۔

۱۲۔ نفس مصدر، صفحہ: ۱۴۹۔

۱۳۔ ڈاکٹر ڈیوڈ وائٹ ہاؤس، "'Oldest' Prehistoric Art Unearthed," (قدیم ترین ماقبل التاریخ فن پارے کا انکشاف)، بی بی سی نیوز، ۱۰ر جنوری ۲۰۰۲ء، انٹرنیٹ پر اس پتے پر دیکھا جا سکتا ہے:

http://news.bbc.co.uk/1/hi/sci/tech/1753326.stm

۱۴۔ جین کلوٹیز، "Chauvet Cave: France's Magical Ice Age Art," (چویٹ نامی غار: فرانس کی عہد برفانی کا ساحرانہ آرٹ)، نیشنل جیوگریفک، اگست ۲۰۰۱ء، صفحہ: ۱۵۶۔

۱۵۔ ڈاکٹر ڈیوڈ وائٹ ہاؤس، "Ice Age Star Map Discovered," (عہد برفانی کے نقشہ کواکب کی دریافت)، بی بی سی نیوز، ۹ر اگست ۲۰۰۰ء، انٹرنیٹ پر اس پتے پر دیکھا جا سکتا ہے:

http://news.bbc.co.uk/1/hi/sci/tech/871930.stm

۱۶۔ http://www.goldenageproject.org.uk/108catalhuyuk.html

۱۷۔ فینومین، ۱۵ر ستمبر ۱۹۹۷ء، صفحہ: ۴۵۔

۱۸۔ روبن ڈینیل، "The World's Oldest Spears," (دنیا کے قدیم ترین نیزے)، نیچر، شمارہ ۳۸۵۔۷، ۲۷ر فروری ۱۹۹۷ء، صفحہ: ۷۶۷۔

۱۹۔ نفس مصدر۔

۲۰۔ ایضاً صفحہ:۸۶۷۔

۲۱۔ ہارٹ مٹ تائیمے، "Lower Palaeolithic Hunting Spears from Germany," (جرمنی میں دریافت شدہ شکار کے ابتدائی پتھر والے نیزے)، نیچر، شمارہ:۳۸۵، ۲۷ فروری-۱۹۹۷ء-صفحہ:۸۰۷۔

۲۲۔ ٹاس ڈیورنڈے یاسام، ("Life in the Stone Age")(پتھر والے دور کی زندگی)، ارض مہتاب نمبر دہم ایک دستاویزی فلم، ٹی آر ٹی۔

۲۳۔ "Bilim ve Teknik"(سائنس اور ٹکنالوجی میگزین)، ستمبر-۲۰۰۰ء-

۲۴۔ فلپ کوہن، "Open Wide," (آشکارتامہ)، جدید سائنس داں، شمارہ ۲۲۸۶، ۱۴/اپریل-۲۰۰۱ء-صفحہ:۱۹۔

۲۵۔ گلائن ایساک، بربراایساک، The Archaeology of Human Origins, (مبدہائے انسانی کا علم آثار قدیمہ)، کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس،-۱۹۸۹ء-، صفحہ ۱۷؛ سی۔بی۔ایم۔ایم سی برنی، ہاؤوافتیا (سائرینیا کا)، کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس،-۱۹۶۷ء-صفحہ:۹۰۔

۲۶ ویڈم این۔سٹپین چک، "Prolom II, A Middle Palaeolithic Cave Site in the Eastern Crimea with Non-Utilitarian Bone Artefacts," (پرولوم دوم، مشرقی کریمیا میں ایک پتھر والے درمیانی دور کی ایک غار کا نمونہ: ہڈیوں کے آرائشی فن پارے) ماقبل التاریخ سماج کے کارنامے-۱۹۹۳ء-صفحہ: ۱۷ تا ۳۷۔صفحہ: ۳۳ تا ۳۴۔

۲۷۔ پال میلرز، The Neanderthal Legacy, (نیندرثال کا ورثہ) پرینسیٹن: یونیورسٹی پریس، -۱۹۹۶ء-صفحہ: ۱۷؛ ویڈم این۔سٹپن چک، "Prolom II, A Middle Palaeolithic Cave Site in the Eastern Crimea with Non-Utilitarian Bone Artefacts," (پرولوم دوم، مشرقی کریمیا میں ایک

پتھر والے درمیانی دور کی ایک غار کا نمونہ: ہڈیوں کے آرائشی فن پارے) ماقبل التاریخ سماج کے کارنامے-۱۹۹۳ء-صفحہ:۱۷ تا ۱۷۳-صفحہ:۱۷-

۲۸- "Neandertals Lived Harmoniously," (نینڈرتال قوم اتفاق واتحاد کے ساتھ رہتی تھی)، اے اے اے ایس سائنسی نیوز سروس، ۳/اپریل-۱۹۹۷ء-

۲۹- روث ہینکے، "Aufrecht aus den Baumen," (درختوں سے اترا ہوا سیدھا انسان) فوکس، جلد:۳۹-۱۹۹۶ء-صفحہ:۱۷۸-

۳۰- ایلائنے مورگن، The Scars of Evolution, (ارتقا کی نشانیاں) نیو یارک: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس،-۱۹۹۴ء-

۳۱- جی، اپریل-۲۰۰۵ء-صفحہ:۴۶-

۳۲- میکائیل بانگنٹ، Ancient Traces: Mysteries in Ancient and Early History, (قدیم نشانیاں: قدیم اور ابتدائی تاریخ کے اسرار ورموز)، انگلینڈ: پینگین بکس،-۱۹۹۹ء-صفحہ:۱۰ تا ۱۱-

۳۳- ڈیوڈ بریوسٹر، "Queries and Statements Concerning a Nail Found Imbedded in a Block of Sandstone Obtained from Kingoodie (Mylnfield) Quarry, North Britain," (شمالی برطانیہ کے کنگ گودی (میلن فیلڈ) پتھر کے کان سے حاصل کردہ بھر بھرے پتھر کے تختے کے اندر سے برآمد میخ کے متعلق سوالات وبیانات)، برطانوی انجمن ترقی سائنس کی سالانہ رپورٹ-۱۸۴۴ء-صفحہ:۵۱-

۳۴- بائی گنٹ، Ancient Traces، (قدیم نشانات)، صفحہ:۱۴-

۳۵- جون بینز، جیرومیر مالیک، Eski Misir Medeniyeti، (قدیم مصر کی تہذیب) استنبول: اشاعت پنجہ-۱۹۸۶ء-تعارف-

۳۶- ویلیم ہوویلس، Getting Here: The Story of Human Evolution، (یہاں سے پایاب: انسانی ارتقا کی کہانی)، واشنگٹن، ڈی۔ سی۔: کیمپاس پریس،

-۱۹۹۳ء-صفحہ:۲۲۹-

۳۷- www.kuranikerim.com/telmalili/hud.htm

۳۸- رڈیارڈ کپلنگ، The Elephant's Child, from Just So Stories (طفل فیل، خواہ مخواہ کی کہانیاں)- ۱۹۰۲ء-
http://www.boop.org/jan/justso/elephant.htm،

۳۹- سٹیفن جے گاؤلڈ، "Introduction," in Bjorn Kurtén, Dance of the Tiger: A Novel of the Ice Age, ('مقدمہ' کوین کرتن میں رقص اسدی، یخ بستہ دور کا ایک ناول، نیویارک، رینڈم ہاؤس، -۱۹۸۰ء-صفحہ:۱۷ تا ۱۸-

۴۰- سٹیفن جے گولڈ، "The Return of Hopeful Monsters," in The Panda's Thumb: More Reflections in Natural History (پرامید بھوتوں کی واپسی ،ریچھ کے انگوٹھے میں: قدرتی تاریخ میں مزید غور وخوض، [۱۹۸۰]، لندن، پینگین، -۱۹۹۰ء-طبع دوم، صفحہ:۱۵۸-

۴۱- سیمون ویلس برڈ، In the World's Last Mysteries (دنیا کے آخری معموں میں)، (طبع دوم) ریڈرز ڈائجسٹ، -۱۹۷۸ء-صفحہ:۱۳۸-

۴۲- گراہم ہینکوک، سنثا فائیا، Heaven's Mirror: Quest for the Lost Civilization, آئینہ ساوی: گمشدہ تہذیب کی تلاش، نیویارک، ثری ریورس پریس، -۱۹۹۸ء-صفحہ:۳۰۴-

۴۳- مصطفیٰ غزالہ، Historical Deception: The Untold Story of Ancient Egypt, (تاریخی فریب، قدیم مصر کی ایک ان کہی کہانی)، بیسٹیٹ پبلشنگ، ایرئی، پا، امریکہ، -۱۹۹۶ء-صفحہ ۲۹۵ تا ۲۹۶-

۴۴- مدیر اہرام، ڈاکٹر زاہی حواس سے ایک انٹرویو-
http://www.pbs.org/wgbh/nova/pyramid/excavation/hawass.html

۴۵- غزالہ، تاریخی فریب، صفحہ:۲۹۶-

۴۶۔
http://www.amonline.net.au/teachers_resources/background/ancient_egypt04.htm

۴۷۔Afet Inan, Eski Misir Tarihi ve Medeniyet (قدیم مصر کی تاریخ وتہذیب)،انقرا:ترک تاریخ کروموباسیموی، ۱۹۵۶ء۔صفحہ:۳۱۸۔

۴۸۔ ایضا:صفحہ:۸۷۔

۴۹۔ ایضا:صفحہ:۲۰۱۔

۵۰۔ جیمس ہنری بریسٹیڈ، Ancient Times or A History of the Early World,(اوقات قدیمہ یاابتدائی دنیا کی ایک تاریخ)۔۱۹۱۶ء۔صفحہ:۶۴۔

۵۱۔ مصطفیٰ غزالہ، Egyptian Harmony: The Visual Music, (مصری دلکش سریلے نغمے:بصری موسیقی)،این سی: ٹیہوٹی ریسرچ فاؤنڈیشن۔۲۰۰۰ء۔صفحہ:۶۴۔

۵۲۔ http://www.waterhistory.org/histories/cairo/

۵۳۔ غزالہ،تاریخی فریب،صفحہ:۱۱۵۔

۵۴۔ ایضاً صفحہ ۱۱۶

۵۵۔ ایضا

۵۶۔ The Eyes of the Sphinx, (ابوالہول کی آنکھیں)این وائی: برکلی پبلشنگ گروپ، ۱۹۹۶ء۔صفحہ:۱۱۸تا۱۱۹۔

۵۷۔ ۲نوا پروکشنز، Who Built the Pyramids, (اہراموں کی تعمیر کس نے کی؟)، www.pbs.org

۵۸۔ فرنک ڈورنن برگ، "Electric Lights in Egypt?"(مصر میں بجلی کی قمقمے؟)
http://www.world-mysteries.com/sar_lights_fd1.htm

۵۹۔ ولیم آر۔ کورلس، Ancient Man: A Handbook of Puzzling Artifacts,(قدیم انسان: عجیب وغریب فن پاروں کاایک کتابچہ)،میری لینڈ:سورس بک پروجکٹ،۔۱۹۷۸ء۔صفحہ:۴۴۳۔

۶۰۔
http://www.unsolved-mysteries.net/english/earchiv/e8archivobj005.html

۶۱۔ ہنری گی، In Search of Deep Time: Beyond The Fossil Record to A New History of Life, (عہد عمیق کی تلاش میں: آثارِ قدیمہ کی دستاویز سے لے کر زندگی کی جدید تاریخ تک)، فری پریس، سیمن اور شسٹر کارپوریشن کا ایک شعبہ: ۱۹۹۹ء۔ صفحہ: ۵۔

۶۲۔ فلپ ای، جانسن، Reason in the Balance: The Case Against Naturalism in Science, (میزان عقل: سائنس، قانون اور تعلیم میں فطریات کے خلاف ایک مقدمہ)، ڈونرز گرو، الیانوس، انٹرورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء۔ صفحہ: ۶۲۔

۶۳۔ ٹیمپل بریٹینیکا، جلد ۱۶، انا یا نجلک، استنبول: جون ۱۹۹۳ء۔ صفحہ: ۲۰۳۔

۶۴۔ جورج کونٹیناؤ، Everday Life in Babylon and Assyria, (اہل بابل اور اسیریوں کی روزمرہ زندگی، لندن، ایڈورڈ ارنولڈ پبلشرز، ۱۹۶۴ء۔

۶۵۔ شمویل نوح کرامیر History Begins at Sumer: Thirty-Nine Firsts in Recorded History, (سومری تاریخ کا نقطہ آغاز: محفوظ شدہ تاریخ میں سرفہرست انتالیس)، فیلاڈیلفیا یونیورسٹی آف پینسیلو ینیا پریس، ۱۹۸۱ء۔

۶۶۔ ڈاکٹر ڈیوڈ وائٹ ہاؤس، "World's Oldest Telescope?", (دنیا کی قدیم ترین دوربین؟)، بی بی سی نیوز، ا رجولائی ۱۹۹۹ء۔
http://news.bbc.co.uk/1/low/sci/tech/380186.stm

۶۷۔ مایان جنتری،
http://webexhibits.org/calendars/calendar-mayan.html

۶۸۔ ڈیوڈ پریمک، "'Gavagai!' or the Future History of the Animal Language Controversy," (گواگئی یا وحشی زبان کے اختلاف سے متعلق مستقبل کی تاریخ)، کوگنیشن، ۱۹، ۱۹۸۵ء۔ صفحہ: ۲۸۱ تا ۲۸۲۔

۶۹۔ ڈیرک بیکرٹن، "Babel's Cornerstone,"(تہذیب بابل کا سنگ بنیاد)، جدید سائنس داں، شمارہ ۲۱۰۲، ۴/۱۱کتوبر ۱۹۹۷ء۔صفحہ:۴۲۔

۷۰۔ رچرڈ ڈاکنس، Unweaving the Rainbow, Boston: Houghton-Miflin(قوس وقزح کی تحقیق وتدقیق)، بوسٹن: ہاؤٹون،فیفلین کمپنی، ۱۹۹۸ء۔صفحہ ۲۹۴۔

۷۱۔ وینڈی کے۔ولکنس اینڈجینی ویک فیلڈ، "Brain Evolution and Neurolinguistic Preconditions," (اعصابی ارتقا اورلسانی مہارت کے لیے اعصابی نظام کےشروط لازمہ) اخلاقی اوردماغی علوم،۱۸(۱):۱۶۱-۲۲۶۔

۷۲۔ نوئم چومسکائی، Powers and Prospects: Reflections on Human Nature and the Social Order(قوتیں اورامکانات:انسانی فطرت اوراس کے معاشی نظم وضبط پر پرغوروخوض)،لندن: پلاٹو پریس،۱۹۹۶ء۔صفحہ:۱۶۔

۷۳۔ سٹیفن ایچ۔ لنگڈون، Semitic Mythology, Mythology of All Races, (سامی قصے کو جملہ نسلوں کالب لباب)، جلدپنجم،آرکائیل نامی امریکی ادارہ،۱۹۳۱ء۔صفحہ:۱۸۔

۷۴۔ سٹیفن ایچ۔لنگڈون، The Scotsman, سکوٹ مین،۱۸/نومبر ۱۹۳۶ء۔

۷۵۔ ایچ۔فرنک فرٹ، Third Preliminary Report on Excavations at Tell Asmar (Eshnunna) : (تل اسمار(اشنونا) کےمقام پرکھدائیوں کی تیسری ابتدائی رپورٹ)، بابل میں تخلیق سے متعلق جدید انکشافات والی کتاب میں پی۔جے۔وائس مین کاایک حوالہ،لندن، مارشل مارگن اینڈسکوٹ،۱۹۳۶ء۔صفحہ:۲۴۔

۷۶۔ پی۔ لے پیج ریناؤف، Lectures on the Origin and Growth of Religion as Illustrated by the Religion of Ancient Egypt,(قدیم مصری دین کےحوالے سے دین کے مبداوعروج پردروس)،لندن: ولیمس اینڈنورگیٹ،۱۸۹۷ء۔صفحہ:۹۰۔

۷۷۔ سرفلنڈرس پیٹری، The Religion of Ancient Egypt, (قدیم

مصریوں کا مذہب)، لندن: کونسٹبل، ۱۹۰۸ء۔ صفحہ: ۳، ۴۔

۷۸۔ ایڈورڈ میک کریڈی، "Genesis and Pagan Cosmogonies," (تخلیق، اور کائنات کی بابت کافرانہ فکر)، ٹرانزکشنز آف وکٹوریا انسٹی ٹیوٹ، جلد ۷۲، ۱۹۴۰ء۔ صفحہ: ۵۵۔

۷۹۔ میکس مولر، History of Sanskrit Literature: quoted by Samuel Zwemer (تاریخ ادبیات سنسکرت، بحوالہ شموئیل زویمر) صفحہ: ۸۷۔

۸۰۔ اکسل ڈبلیو۔ پرسون، The Religion of Greece in Prehistoric Times, (ماقبل التاریخ ادوار میں یونانی قوم کا دھرم)، کیلیفورنیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۲ء۔ صفحہ: ۱۲۴۔

۸۱۔ Review of Irene Rosenzweig's Ritual and Cults of Pre-Roman Iguvium by George M. A. Hanfmann, (رومیوں سے ماقبل ایگویوں کی عبادات اور دینی رسوم پر ایک تبصرہ، مرتبہ: ایم اے حنف مان)، آثار قدیمہ کا امریکی رسالہ، شمارہ: ۴۳، نمبر ۱، جنوری - مارچ، ۱۹۳۹ء۔ صفحہ: ۱۷۰

۸۲۔ ٹم فولگر، "From Here to Eternity," (یہاں سے ازل تک)، ڈس کور، جلد ۲۱ نمبر ۱۲۔ دسمبر۔ ۲۰۰۰ء۔